قاری مُحمد طیّب

برائے کارکنانِ دعوت و تبلیغ

اسلام میں دعوت و تبلیغ

کے اصول اور قواعد

مولانا قاری محمد طیب

دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

مطبوعات نمبر ۱۷۸

نام کتاب ——— اسلام میں دعوت و تبلیغ

مصنف ——— قاری محمد طیب

رابطہ کار ——— محمد شاہد رفیع

سرورق ——— سید مبین الرحمٰن

طابع ——— آئی آر آئی پریس۔ اسلام آباد

ناشر ——— دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
اسلام آباد

تعداد ———

تاریخ اشاعت ——— ستمبر ۱۹۹۱ء

پیش لفظ

اللہ رب العالمین نے زمین پر انسان کو بھیجنے کے ساتھ ہی اس کی ہدایت و راہنمائی کا بھی ایسا مسلسل اور دائمی انتظام فرمادیا کہ یہ دنیا ہدایت الٰہی اور ہدایت یافتہ لوگوں سے کسی بھی وقت خالی نہ رہے۔ ابتداء میں روئے زمین پر تھوڑے ہی لوگ تھے ان کی ہدایت کا سلسلہ چلتا رہا پھر آبادی بڑھی اور شعوب و قبائل بنے تو ارحم الراحمین نے ہر ہر قوم اور ہر ہر علاقہ میں الگ الگ اپنے انبیاء اور رسل بھیجے۔ "ولقد بعثنا فی کل رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت" (النحل ۔ ۱۶ : ۳۶) لیکن یہ سارے رسول اپنی اپنی قوم اور برادری کو راہ راست پر لانے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ ان کا پیغام عالمگیر حیثیت کا حامل نہیں تھا۔ قرآن کریم میں اس بات کی بار بار صراحت کی گئی کہ ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف ہود کو قوم عاد کی طرف صالح کو قوم ثمود کی طرف اور شعیب علیہ السلام کو مدین کی طرف بھیجا۔ حتی کہ حضرت عیسی علیہ السلام جن کا نام استعمال کر کے مختلف سیاسی و معاشی فوائد کی خاطر "عیسائیت" کی تبلیغ کی جاتی ہے ان کے متعلق نہ صرف قرآن نے یہ بتایا کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے بلکہ خود انجیل میں موجود ہے کہ "میں صرف بنی اسرائیل کو تبلیغ کرنے کے لئے آیا ہوں لہذا کسی اور کو یہ نعمت کیوں دے دوں۔" "میں صرف بنی

اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے لئے آیا ہوں، پس میں بچوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا۔ (متی : ۱۵ باب ۱)"

ان سب انبیاء کے برعکس رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری دنیا میں قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے" وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً (سبا ۳۴-۲۸) "اور ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کیلئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا"

تمام انسانوں تک اسلام کی اس دعوت کو پہنچانے کے لئے اس پوری امت کو دعوت و تبلیغ کا نبوی فریضہ سپرد کیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ کی اسلام میں اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دعوت کا لفظ قرآن میں دو سو سے زائد مرتبہ استعمال ہوا ہے اور تبلیغ کا لفظ ستر سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت کے لئے ہادی و رہنما بنا کر بھیجے گئے تھے اس لئے آپ کی لائی ہوئی اس ہدایت کو رہتی دنیا تک تمام انسانوں تک پہنچنا چاہیئے۔ دعوت کے اس تسلسل کے ساتھ پہنچتے رہنے کا انتظام اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کو بھی دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری سونپ دی۔ اب جس طرح تمام انبیاء قیامت کے دن اپنی اپنی قوم تک دین کی دعوت پہنچانے کی گواہی دیں گے اسی طرح اس امت کو بھی اللہ تعالیٰ کے حضور یہ بتانا ہوگا کہ اس نے دین کو لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری کس حد تک پوری کی ہے۔ ظاہر ہے کہ شہداء علی الناس کے اس قدر اہم کام کے بارے میں داعی اعظم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جو ہدایات دی ہیں وہی اس کام کے لئے موزوں ترین اور موثر ترین بھی ہو سکتی ہیں اور اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول کا واحد ذریعہ بھی وہی ہو سکتی ہیں۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کارکنان دعوت و تبلیغ

کے لئے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم اس وقت ان کی بلند پایہ اور مفید کتاب ہدیہ قارئین کر رہے ہیں یہ اپنے موضوع پر ایک بہت اہم اور عالمانہ تحریر ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف عام افراد کو دعوت و تبلیغ کی اہمیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ اس اہم کام میں مصروف داعیان دین اور کارکنان دعوت و تبلیغ کو منہاج تبلیغ کے اصول بھی زیادہ واضح طور پر معلوم ہو سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دعوت و تبلیغ کا کام بہتر سے بہتر طور پر کرنے کی توفیق و صلاحیت عنایت فرمائیں۔ آمین۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
ڈائریکٹر جنرل
دعوۃ اکیڈمی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلام میں دعوت و تبلیغ کے اصول اور قواعد

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی سعادت کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے۔ صلاح اور اصلاح یعنی خود صالح بننا اور پھر دوسروں کو صالح بنانا یا خود کمال پیدا کر کے دوسروں کو باکمال کر دینا جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں محض محدود اور ذاتی نفع پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ اس کو لا محدود اور متعدی بنایا گیا ہے چنانچہ قرآن وسنت کی متعدد آیات و روایات اس پر شاہد ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے:

پھر اس اصلاح یا کامل بننے کی بنیاد بھی دو چیزوں پر ہے علم نافع اور خلقِ عادل علم تو راستہ دکھاتا ہے اور اخلاق کی طاقت اس پر چلاتی ہے جس سے صلاح کی منزلِ مقصود سامنے آجاتی ہے اگر علم نہ ہوتا تو راہِ حق ہی نہیں کھل سکتی کہ چلنے کی نوبت آئے اور

اگر اخلاق میں اعتدال نہ پیدا ہو جو عمل کی مخفی طاقت ہے تو اس کھلی راہ پر چلنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ پس علم محض راہ ہے اور خلق محض رہروی کی طاقت اور ظاہر ہے کہ نہ محض راہ سے منزلِ مقصود آتی ہے نہ مطلقاً رفتار سے بلکہ راہ اور رفتار کے اجتماع میں ہی وصولِ بمنزل کا راز پنہاں ہے اس سے واضح ہو گیا کہ اصلاح کی حقیقت تحصیلِ علم اور تعدیلِ اخلاق ہے اسی سے اصلاح کی حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں کو صحیح علم پہنچانا اور ان کی اخلاقی حالت درست کرنا ہے علم پہنچانے کو تعلیم اور تعدیلِ اخلاق کو تربیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس لئے اصلاح کی تمام حقیقت تعلیم و تربیت نکل آتی ہے۔

صلاح و اصلاح کی اہمیت

پھر اصلاحِ نفس کے حصول کا ذریعہ تو راہ علم و اخلاق میں مجاہدہ و ریاضت ہے اور اصلاحِ غیر کا ذریعہ دعوت و ارشاد اور تبلیغ و موعظت ہے اس لئے تکمیلِ سعادت کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ خود عالم باعمل بن کر دوسروں کو دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے عالم و عامل بنایا جائے پس انسان صلاح و رشد کے کتنے ہی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ پہنچ جائے لیکن جب تک وہ اپنی استطاعت کے مطابق یہ صلاح و رشد اپنے بھائیوں تک پہنچانے کا اہتمام نہ کرے اس وقت تک وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے جہاں اپنے پیرؤوں کو خود اُن کی ذاتی تہذیب و شائستگی کے لئے علم و اخلاق اور اعتقادات و اعمال کے ایک جامع پروگرام پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے وہیں اُن کے لئے اس پروگرام کی تبلیغ و دعوت اور ارشاد و تلقین کا محکم بھی صادر فرمایا ہے تاکہ ایک کے ذریعے دوسرا مہذب اور شائستہ بن سکے

پس اگر اعتقاد توحید و رسالت اور عام عبادات اور ریاضت، نماز، روزہ، حج

جہاد اور احسان وصلہ وغیرہ اس وجہ سے فرض ہیں کہ قرآن و حدیث نے ان کا صراحتاً حکم دیا ہے تو دعوت و ارشاد اور تبلیغ و موعظت بھی اس لئے فرضِ قطعی ہے کہ کتاب و سنت ہی نے اس کا صریح اور غیر مشتبہ حکم دیا ہے جس کے بارے میں کتنی ہی آیات و روایات وارد ہوئی ہیں۔ ان بیسیوں نصوص میں سے آیت ذیل کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں دعوت الی اللہ کے حکم قطعی کے ساتھ اس منصب دعوت کے آداب و شروط اور بنیادی دستور العمل پر بھی اصولی حیثیت سے ایک گہری اور جامع روشنی ڈالی گئی ہے جو اس وقت ان مختصر اوراق کا موضوع بحث ہے۔

دعوتی پروگرام کی اجمالی تعیین

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خیر للصابرین واصبر وما صبرك الا بالله ولا تحزن علیهم ولا تك فی ضیق مما یمکرون ان الله مع الذین اتقوا والذین هم محسنون۔

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے سے بلایئے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجیے آپ کا رب اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے گم ہوا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور مخالفوں کے جواب میں سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی جیسے تمہارے ساتھ کی گئی ہے اور اگر تم نے صبر کیا (یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہ دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے (سورہ نحل)

مقاماتِ دعوت

اس آیت میں اولاً سید الداعین صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً اُمت کے تمام منصب یافتگان دعوت و تبلیغ کو دعوتِ الی اللہ کا حکم دیا گیا ہے یہ فعل دعوت الی اللہ جو صیغہ اُدع سے واضح ہو رہا ہے چونکہ متعدی فعل ہے اس لیے اسے سب سے پہلے تو فاعل کی ضرورت ہے جسے داعی کہا جائے گا پھر مفعول کی جسے مدعو کہیں گے۔ اور پھر اس چیز کی جس طرف دعوت دی جائے جسے "مدعو الیہ" سے یاد کیا جائے گا اس طرح اس صیغہ اُدع سے چار مقام پیدا ہو جاتے ہیں جن کی تشریح سے ہی فی الحقیقت منصب دعوت وارشاد کی تشریح ہو سکتی ہے۔

۱۔ دعوت

۲۔ داعی

۳۔ مدعو

۴۔ مدعو الیہ

دعوت کا کلمہ اُدع سے نکلتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُدع فعل ہے اور ہر فعل کے لیے ایک مادہ ضروری ہے جس سے وہ مشتق ہو اور بنایا جائے ظاہر ہے کہ فعل اُدع کا یہ مادہ دعوت ہی ہے جس سے یہ صیغہ بنا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ فعل ہو اور اس کا مادہ اس میں نہ ہو اس لیے کہ فعل تو اس مادہ کی محض ایک صورت ہوتا ہے۔ اگر مادہ نہ ہو تو صورت کس چیز پر کھینچی جائے اس لیے کلمہ اُدع سے دعوت کا نکلنا محض فنی قواعد پر ہی مبنی نہیں بلکہ عقلاً بھی ضروری ہے۔ جب فعل دعوت اس آیت کی عبارت سے ثابت ہے تو داعی مدعو الیہ کا ثبوت قدرتی طور پر خود بخود ہو جاتا ہے کہ کوئی دعوت بغیر اپنے مخاطب (مدعو)

کے دعوت نہیں کہلا سکتی اور داعی بغیر دعوت کے داعی نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس طرح کوئی داعی اور مدعو بغیر اس شئے دعوت کردہ کے داعی اور مدعو نہیں ہو سکتے جس کی وجہ سے وہ داعی اور مدعو بنے ہیں اس لیے یہ چاروں مقامات جن پر ہمیں بحث کرنی ہے نصِ آیت ہی سے صاف طور پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

پھر چونکہ اس فعلِ دعوت الی اللہ کا خطاب حق تعالیٰ کی طرف سے اولاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اس لیے بدلیل تخاطب اس دعوت کے داعی اول بنصِ آیت حضور ہوں گے اور پھر اُمت کے تمام وہ منصب دارانِ دعوت و تبلیغ جو آپ کے اس نقشِ قدم پر چل رہے ہوں۔ پس اب اس فعل دعوت کے داعی بنصِ آیت سے ہی متعین ہو گئے۔

چونکہ آپ کی دعوت کسی قوم و ملت کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ بفحوائے اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا سارے عالم کے لیے ہے اور اسی لیے اس بارے میں آیت مطلق ہے کسی خاص قوم و ملک سے مقید نہیں کہ اسی کو دعوت دی جائے اسی لیے مدعو ساری اُمتیں ہوں گی اور وہ سب بلحاظِ دعوتِ عامہ آپ ہی کی اُمت کہلائیں گی۔ اس لیے اصطلاحی الفاظ میں دورۂ محمدی کی تمام اقوام و ملل کے مجموعہ کو اُمتِ دعوت کہا جاتا ہے گو بظاہر اس مفعول (یعنی عام مدعوین) کا عبارت آیت میں کوئی تذکرہ نہیں لیکن اگر قواعد عربیہ سے غور کیا جائے تو یہ تذکرہ نہ ہونا ہی ان مدعوین کا سب سے بڑھ کر تذکرہ ہے کیونکہ جب مفعول میں کوئی تخصیص پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ تعمیم اور اطلاقِ عام ملحوظ ہوتا ہے تو مفعول کو لفظوں میں ذکر نہیں کرتے پس جبکہ یہاں دعوت کا ذکر کر کے مدعو کا ذکر چھوڑ دیا گیا تو عربی قواعد کے مطابق یہ اس کی دلیل ہے کہ اس دعوت کا مدعو کوئی خاص فرد یا قوم نہیں بلکہ ہر وہ فرد بشر ہے جس میں خطاب کو سمجھنے کا مادہ موجود ہے۔ اس لیے مدعو کے دائرے میں تمام اقوامِ عالم کا متعین ہونا بھی اسی آیت سے

ثابت ہوگیا۔

اس پروگرام کی تعیین بھی جس کی طرف دعوت دی جائے گی یعنی مدعوالیہ صراحتہً الفاظ آیت سے ہورہی ہے کہ وہ "سبیل ربّ" ہے۔

بہرحال یہ چاروں مقامات دعوت، داعی، مدعو، مدعوالیہ اور پھر ان چاروں کے مصداق جو یہاں مراد ہیں، نفس آیت ہی میں مذکور اور اس سے ثابت شدہ نکلتے ہیں فرق ہے تو یہ کہ دعوت و داعی اور مدعوالیہ کا تذکرہ تفصیلی اور تعین کے ساتھ ہے اور مدعوین یعنی اقوام و ملل کا ذکر محض اجمالی اور کلی طور پر کیا گیا ہے جس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اس آیت دعوت کا مقصود اصلی مدعوین کی اصلاح و ہدایت ہے اور اس ہدایت و اصلاح کا دار و مدار درحقیقت دعوت کی خوبی، داعی کی قابلیت اور پروگرام کی مقبولیت پر ہے یعنی پروگرام جاذب توجہ ہو جو مدعو کو اپنی طرف کھینچ لے دعوت دلآویز ڈھنگ سے ہو کہ مدعو کو جانے نہ دے داعی کا کیریکٹر معیاری ہو جو مدعو پر اثر ڈال سکے۔ اس لئے اگر فی الحقیقت ضرورت تھی تو زیادہ تر انہی تین چیزوں کے آداب و اوصاف کی تفصیل کی تھی تاکہ مدعو کو کامل ہدایت ہو جائے مدعو کوئی خاص فرد یا طبقہ معین ہی نہ تھا کہ اس کی تعیین و تفصیل کی ضرورت پڑتی۔ پس حق تعالیٰ نے مدعوین ہی کی مصلحت سے (جو اس آیت کا اصل مقصد ہے) آیت میں دعوتی پروگرام، پھر دعوت الی اللہ کے انواع و اقسام اور اس کے رنگ ڈھنگ اور پھر دعوت دہندوں کے مخصوص احوال و اوصاف پر خصوصی و گہری روشنی ڈالی ہے اور ذیلی طور پر مدعوین کے خاص اوصاف بھی ثابت فرما دیئے ہیں جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے

(۱) دعوتی پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مدعوین تک پہنچنے کی صلاحیت ہو۔

(۲) دعوت کی خوبی یہ ہے کہ وہ مدعو اور مخاطب کے مناسب حال ہو۔

(۳) داعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا علمی اور اخلاقی معیار بلند ہو۔

(۴) مدعو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قبولِ حق کا جذبہ موجزن ہو۔

انہی چہارگانہ مقاصد کی تفصیلات پورے مالہٗ و ماعلیہ کے ساتھ اس آیت دعوت میں فرمائی گئی ہے

ہم ذیل میں انہی کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

خالص عقلی اور ذاتی امور تبلیغ کا موضوع نہیں ہیں

دعوتی پروگرام کے سلسلے میں جس کی طرف لوگوں کو بلایا جائے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مخاطب کے حق میں کوئی طبعی اور ذاتی چیز نہ ہو بلکہ ایک بیرونی اور القائی چیز ہو جسے تبلیغ کے ذریعے اس میں اتارا جائے ورنہ اگر وہ چیز مخاطب کے جذر طبیعت میں پہلے ہی موجود ہے تو تبلیغ و دعوت کی حاجت ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ تحصیل حاصل ہوگی۔

اس اصول کے ماتحت طبعیات دائرہ تبلیغ سے خارج ہو جاتے ہیں کہ ان کی طرف رہنمائی انسان کی پیدائشی طبیعت خود کرتی ہے خواہ کوئی ہادی آئے یا نہ آئے مثلاً کھانا، پینا، سونا، جاگنا، رغبت و نفرت، رونا، ہنسنا، بولنا چالنا اور چلنا پھرنا وغیرہ انسان کے لئے ایسے طبعیاتی امور ہیں جو بہ تقاضائے طبع اس سے سرزد ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی ایک انسان کا بچہ اپنے طبعی داعیہ سے خود بخود کرنے لگتا ہے گویا سیکھا سکھایا پیدا ہوتا ہے اس لئے ان امور میں اسے نہ کسی معلّم کی حاجت ہے اور نہ داعی و مبلّغ کی۔

اسی طرح عقلیات کے سلسلہ میں بھی تبلیغ و دعوت کی ضرورت نہیں ہو سکتی کہ عقل تھوڑی ہو یا بہت انسان میں موجود ہے اور ہر ایک انسان جب تک وہ دیوانہ نہیں ہے بغیر کسی معلّم عقل کے خود بخود اپنے دماغ پر بوجھ ڈال کر عقل ہی کی کہتا ہے

اور عقل ہی کی بات باور کرتا ہے نیز عقلی اختراعات میں عقل ہی کے دباؤ سے بقدر بساط
حصہ لینے کی کوشش بھی کرتا ہے اسی لئے عقلیات میں تقلید نہیں ہے ہر شخص کو رائے زنی کا حق ہے
پھر اگر بڑی عقل والے کم عقل کے کلام کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے اور اپنا کوئی نقصان اس میں محسوس
نہیں کرتے تو ہو سکتا ہے کہ کم عقل بھی کسی بڑی عقل والے کی خلاف ورزی میں اپنا کوئی ضرر محسوس
نہ کریں کیونکہ ضرر کا تعلق احساس سے ہے کم عقل جب اس تعبد ضرر کا وہ احساس ہی نہیں رکھتا
جو کثیر العقل رکھتا ہے تو یہ ضرر اس کے لئے تکلیف دہ ہی نہیں بن سکتا اگر بن سکتا ہے تو اس بڑی
عقل والے کے لئے جسے اس ضرر کا احساس تھا۔ اس بنا پر عقلیات میں بھی تبلیغ کی حاجت
باقی نہیں رہتی اور جبکہ محسوسات میں بھی تبلیغ کی حاجت نہیں ہے اور طبعیات اور عقلیات
بھی تبلیغ سے مستثنیٰ ہیں تو اب یہ امر واضح ہو گیا کہ تبلیغ صرف ایسے ہی مقاصد کی ہو سکتی ہے
جو انسان میں دعوت تبلیغ و تلقین ہی سے پیدا ہو سکتے ہوں اور پہلے سے اس کے اندر نہ ہوں
اس کے بعد اس پر غور کرنا چاہیے کہ یہ بیرونی مقاصد جو انسان میں پہنچائے جائیں کہاں
سے لائے جائیں گے؟ ظاہر ہے کہ انسان کے سوا کسی دوسری مخلوق کے دائرہ سے لا کر انسان
میں ڈالے ہی نہیں جا سکتے کیونکہ اس دائرہ کی سب شئے برتر اور اکمل نوع تو خود انسان ہی ہے
اور وہ جب خود اپنے ہی نوع کے ذاتی امور عقل طبع اور حس وغیرہ میں ایک دوسرے کا مکلف
نہیں تو اپنے سے ارذل و کمتر انواع جمادات، نباتات، حیوانات کی ذاتیات کا کب مکلف ہو
سکتا ہے کہ یہ کم رتبہ چیزیں اسے تبلیغ کریں اور اسے حد کمال پر پہنچائیں نیز جو باتیں ان
انواع میں موجود ہیں جیسے جمادات کی جمادیت، نباتات کا نشو و نما، حیوانات کا حس و شعور
سب انسان میں ہی موجود ہیں اور طبعی ہو کر پائی جاتی ہیں تو پھر ان کی تبلیغ کی حاجت ہی نہیں
ہو سکتی ہے اور وہ بھی اپنے سے ارذل اور کمتر کے ذریعے اگر پھر بھی وہ ان سے مستفید
ہونے لگے تو یہ تکمیل نہ ہو گی بلکہ تنقیص ہو گی جسے تبلیغ نہیں کہہ سکتے کہ تبلیغ تکمیل کے لئے
ہوتی ہے نہ کہ تنقیص کے لئے اس سے ظاہر ہے کہ تبلیغ لامحالہ ایسے ہی امور کی

ہو سکتی ہے جو نہ خود انسان کے اندر ہوں نہ دوسری مخلوقات سے اس میں لائے جا سکے
ہوں گویا پوری مخلوقات ان سے خالی ہو تو قدرتی طور پر اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ تبلیغی
امور انسان کے خالق کی طرف سے اس میں آ سکتے ہوں جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا
چاہیے کہ مخلوق کی ذاتیات یعنی عقل و طبع اور حس کے بجائے اسے صرف خالق کی ذاتیات یعنی علوم
و کمالات معارف و حقائق اور اخلاق و صفات ربانی ہی کی تبلیغ کی جائے گی تاکہ وہ حد کمال
پر پہنچایا جا سکے اب اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ نکلا کہ تبلیغ نہ حسیات کی ہو سکتی ہے اور
نہ طبعیات کی نہ وہمیات کی ہو سکتی ہے نہ عقلیات کی بلکہ صرف شرعیات کی ہو سکتی ہے
جو خالق سے منقول ہو کر انسان تک پہنچیں کہ شرعیات کے سوا تمام چیزیں انسان میں
قبل از تبلیغ خود بھی بہ تقاضائے طبع موجود ہوتی ہیں۔

تبلیغ صرف علم دین کی ہونی چاہیے

بہر صورت تبلیغی چیز صرف علم الٰہی ہے جسے علم شرع کہا جاتا ہے اور اس لئے
یہ واضح ہو گیا کہ پروگرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ خدا کی طرف سے
ہو مخلوقاتی دائرہ کی چیز نہ ہو کہ مخلوق کی طرف سے جو علم و فن بھی ہو گا وہ محض طبعیاتی یا عقلیاتی
دائرہ کا ہو گا جس کی تبلیغ کا انسان محتاج نہیں اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ
دعوتی پروگرام کی یہ خصوصیت تشریعیت ہونی چاہیے کہ وہ منجانب اللہ ہو منجانب خلق نہ ہو۔ خود
کہ دونوں مدعو الیہ یعنی دعوتی پروگرام کی خصوصیت اس آیت دعوت سے صاف نکل رہی ہے
کیونکہ آیت میں مدعو الیہ کی تعیین سبیل ربک کے کلمہ سے کی گئی ہے کہ خدا کے
راستے کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور خدا کا راستہ ہی شرعیاتی ہے جو اس کے علوم و کمالات
اور اخلاق پر مشتمل ہے جیسا کہ ابھی واضح ہوا اس لئے مدعو الیہ کے سلسلہ کا ایک مقام
آیت دعوت سے حل ہو گیا۔

نیز جبکہ عبارت آیت میں منطوقاً امر کیا گیا کہ تبلیغ خدا کے راستے کی کرو اور خدا کا راستہ دینی شریعت یا شرعیاتی پروگرام ہے جو اخلاقِ ربانی یا علمِ الٰہی پر مشتمل ہے تو اسی آیت کے مفہوم سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ غیر خدا کے راستے کی طرف شرعیاتی دعوت مت دو اور غیر خدا کا راستہ وہی طبعیاتی یا عقلیاتی پروگرام ہے جو ہر انسان کی طبیعت سے خود بخود ابھرتا ہے جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اختراعات و محدثات اور بدعات کی تبلیغ جائز نہیں کہ وہ خدا کے راستے کا پروگرام ہی نہیں وہ سبیل رب ہونے کی بجائے سبیل نفس یا سبیل خلق ہے جو عموماً مذہبی لوگوں کے غلو تعمق نظر اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے پس داعی اور مبلغ کو ہر مسئلہ کی تبلیغ سے پہلے اس پر غور کر لینا چاہیئے کہ جس مسئلہ کی وہ تبلیغ کر رہا ہے آیا وہ شرعی بھی ہے یا نہیں؟ یعنی کسی مسئلہ کا محض زبان زد ہو جانا یا رواج پکڑ جانا یا مطلقاً کسی کتاب میں طبع ہو جانا اس کے شرعی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان ثقات اہل شریعت کی زبان و قلم سے اس کی تصدیق و تائید اور نقل و روایت نہ ہو۔ جن کا رات دن کا مشغلہ شریعت کی تعلیم اور شرعی کتابوں میں تفکر اور رد و کد ہو۔ غرض داعی الی اللہ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے دعوتی پروگرام کو لوگوں کے نفسیاتی اختراعات و جذبات یا اہل تعمق اور ارباب غلو کے تراشیدہ رسوم اور آلائشوں سے پاک و صاف کر کے صرف اصلی اور سادہ دین پیش کرنے اور خالص وحی کی تبلیغ کرے جو منقول ہو کر ہم تک پہنچتی ہے کیونکہ مکمل وحی آجانے کے بعد اختراع کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہتا کہ بدعات کی تبلیغ جائز کی جائے بلکہ صرف اتباع کا درجہ رہ جاتا ہے لہٰذا موضوع اور منکر روایات، زبان زد اسرائیلیات، من گھڑت قصے، کہانیاں، ہنسی اور ٹھٹھے کی باتیں جو عموماً پیشہ ور واعظوں کا پیشہ بن گئی ہیں سبیل رب کے لفظ سے سب ممنوع ٹھہر جاتی ہیں جن سے مبلغ کو احتراز کرنا ضروری ہے ورنہ وہ اسلام کی نہیں بلکہ اسلام میں سنت جاہلیت کی اشاعت کا مرتکب ہو گا جس سے اس کی تبلیغ بجائے مفید ہونے کے مضر اور بجائے امن و سکون قائم کرنے کے فتنہ

کا ذریعہ ثابت ہو گی جو مختلف قسم کے نزاعات و مجادلات اور فرقہ بندیاں پیدا کر دے گی جن سے امت میں کمزوری آجانا ایک امر طبعی ہو گا جیسا کہ آج کل پیشہ ور لیکچراروں اور خود غرض خطیبوں کی تبلیغی نمائشوں سے نمایاں ہو رہا ہے ظاہر ہے کہ اس تبلیغ کے ہونے سے اس کا نہ ہونا بہتر ہے بہر حال شرعیات کی تبلیغ آیت کے منطوق سے ضروری نکلی اور غیر شرعیات کی تبلیغ اسی آیت کے مفہوم سے ممنوع ثابت ہوئی۔

دعوتی پروگرام کی سادگی

نیز اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ تبلیغی مسائل میں بے تکلفی ہی ملحوظ خاطر رہنی چاہیئے کیونکہ سبیل رب کی تبلیغ میں تو صرف نقل کی ضرورت ہو سکتی ہے جس میں کسی تکلف اصلاً حاجت نہیں اور غیر سبیل رب میں اختراع و ایجاد کی ضرورت ہے جس کی بنیاد تکلف پر ہے گویا بدعت تو بنانی پڑتی ہے جس کا حاصل تصنع ہے اور سنت بنی بنائی چیز ہے جس کا صرف نقل کر دینا کافی ہے نہ اس میں تکلف درکار ہے اور نہ تصنع۔ پس جو مبلغ حقیقتاً خدا کا راستہ دکھائے گا اس کے مقاصد اور بیانات میں سادگی اور بے تکلفی ہو گی اور جو لوگوں کو اپنی طرف بلائے گا اسے اپنے بیانات میں یقیناً طرح طرح کے تکلفات، تصنعات اور بناوٹوں کو دخل دینا پڑے گا۔ مثلاً تقریر کے نرالے ڈھنگ اختیار کرنا۔ آواز میں انداز پیدا کرنا ہیئت میں خاص خاص بناوٹیں دکھانا، اسٹیج پر بن کر آنا۔ خاص انداز سے بولنا، تھیٹر کے سے ڈراموں کی نقلیں اتارنا، الفاظ میں قافیہ اور سجع کی رعایت بتکلف کرنا وغیرہ وغیرہ جس سے سامعین کی توجہات اپنی طرف جذب کی جا سکتی ہوں غرض اپنے کو یا اپنے بیان کو بنانا محض تصنع اور بناوٹ ہے اور اس سادگی کے منافی ہے جو سبیل رب کے جملہ سے نکل رہی ہے اس لئے کہ اس جملہ سے تبلیغ کے تکلف و تصنع کی نفی بھی نکلی جو آج کل کے پیشہ ور واعظوں اور خود رو لیڈروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ قرآن کریم

نے ایک دوسری جگہ خاص تبلیغ ہی کے سلسلے میں اس تصنع کی کھلی نفی بھی فرمائی ہے۔

ارشادِ حق ہے :-

قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلفین

ان ھو الا ذکر للعلمین ۔

(اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس قرآن کی تبلیغ پر نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں (اس لئے کہ) یہ قرآن تو اللہ کا ذکر ہے (اور ذکر الٰہی میں بناوٹ کی حاجت ہی نہیں وہ تو بنی بنائی چیز ہے جو اوپر سے اتار دی گئی ہے۔)

دعوتی پروگرام کی جامعیت

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ دعوتی پروگرام صرف سبیلِ ربّ اور وحی ہو سکتی ہے کہ جس سے نہ اختراع ہو نہ بدعت نہ تکلف ہو اور نہ تصنع، اب اس پر غور کرنا چاہیئے کہ آیا اس وحی میں تبلیغ عام اور ساری اقوام میں پھیل جانے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں؛ اور آیا یہ وحی کسی خاص قوم اور خاص وطن کے لئے تو نہیں آئی؟ کیونکہ اگر کسی پروگرام میں ذاتی طور پر عمومیت اور ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہو کر اجتماعی دستور العمل بننے کی صلاحیت ہی نہ ہو بلکہ وہ کسی قومیت یا وطنیت کے لئے مخصوص ہو تو ظاہر ہے کہ وہ پروگرام تبلیغی کہلایا ہی نہیں جا سکتا کہ اس کے لئے تبلیغ و دعوت اور آدابِ تبلیغ کا کوئی نظام زیرِ غور آئے قرآن کریم نے ایسے پروگراموں کی طرف بھی اشارے فرمائے ہیں جو کسی قومیت کے لئے مخصوص ہوں۔ فرمایا گیا :

"ولکل قوم ھاد" : ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کنندہ آیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب قوم قوم کے لئے الگ الگ ہادی آئے ہیں تو ہر ایک ہادی اپنی ہی

قوم کا ذمہ دار بھی بن کر آیا ہے جس کے معنی یہ نکل سکتے ہیں کہ اس کا تبلیغی پروگرام بھی اسی کی قوم کے لئے مخصوص تھا ورنہ اسے کسی مخصوص قوم کا ہادی نہ فرمایا جاتا اور اس کی تبلیغ اسی کی قوم کے دائرہ تک محدود نہ رہتی۔ ظاہر ہے کہ ایسے پروگراموں میں جن میں قومیت کی حد بندیاں قائم ہوں، تبلیغ عام کی صلاحیت اور ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہونے کی قابلیت ہی نہیں ہوتی کہ اسے عمومی تبلیغ کا مسلک کہا جائے اگر ایسے مخصوص پروگراموں کو خواہ مخواہ دوسری اقوام تک پہنچانے کی کوشش بھی کی جائے گی تو وہ یقیناً بیچ میں رہ جائیں گے یعنی وہ دوسری اقوام تک تو ان کے مناسب مزاج نہ ہونے کے سبب پہنچ نہ سکیں گے ہاں اپنی قوم سے ضرور منتقل ہو جائیں گے جس سے یہ مبلغ قوم تو پروگرام سے خالی ہو جائے گی اور دوسری قوم اس سے منتفع نہ ہو سکے گی اس لئے یہ پروگرام نہ اس قوم کا اپنا ہی رہے گا نہ دوسروں ہی کا ہو گا نیز خود یہ قوم بھی نہ ادھر کی رہے گی اور نہ ادھر کی۔

دعوتی نقطۂ نظر سے دیگر مذاہب کا جائزہ

ا۔ عیسائی مذہب

مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "میں اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں"۔ ظاہر ہے کہ اس دعوے کے بعد انجیلی پروگرام غیر اسرائیلی دنیا کے لئے پیغام ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ اسے ساری دنیا کا جامع مسلک کہا جائے کہ وہ محض اسرائیلی مزاج کے مطابق فقط قوم اسرائیل ہی کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن جبکہ زور اور قوت کے بل بوتے پر اسے عالمگیر بنانے کی لاحاصل سعی کی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ پھیل کر خود اسی کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ خود اپنوں کی نگاہوں ہی میں ہلکا ہو گیا چنانچہ آج زیادہ تر انہیں اقوام کو عالمگیر مذہب کی تلاش ہے جو اس قومی مذہب کو عالمگیر دیکھنا چاہتی تھیں اور آئے دن اونچی دنیا کے عیسائیوں ہی کے اعلانات کسی اجتماعی

مسلک اور جامع الملل مذہب کی طلب کی تلاش میں نکلتے رہتے ہیں جس سے صاف واضح ہے کہ ان کی یہ بھیکی اور بے روح عیسائیت آج محض قومیت کی شیرازہ بندی کے لئے رہ گئی ہے کسی دینی دستور العمل یا پروگرام کی حیثیت سے قائم نہیں ہے۔

۲۔ ہندو مذہب

یا مثلاً ہندو مذہب کی نوعیت جبکہ ایک وطنی مذہب کی ہے جو دوسرے وطنوں کے لئے پیام کی حیثیت نہیں رکھتا اسی لئے اس کی تعلیمات میں دائرہ کو تنگ رکھنے اور وسیع نہ کرنے کی خاص کوشش کی گئی ہے مثلاً اس کی ہدایات کی رو سے سمندر کی سیاحت یا سمندر پار جانا مذہبًا ممنوع ہے آج اس کی جو کچھ بھی تاویل کی جاتی ہو مگر مسئلہ کی نوعیت ان کی صریح عبارتوں سے یہی نکلتی ہے ظاہر ہے کہ جس مذہب نے اپنے پرچارکوں کو یہ تعلیم دی ہو کہ وہ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح اپنے وطن کے کنارے سے باہر کی طرف جھانک بھی نہ سکیں تو اس مذہب میں پھیل جانے یا دوسروں سے آنکھ ملانے اور ایک وطن سے دوسرے وطن تک منتقل ہونے کی کیا صلاحیت ہو سکتی ہے مذہب نے جب خود مبلغین مذہب ہی میں ملک کی چہار دیواری سے باہر نکلنے کی استعداد فنا کر دی تو مذہب کی تبلیغی صلاحیت معلوم ۔۔۔۔۔۔

جہاں یہ تعلیم ہو کہ ویدوں کا علم پنڈتوں کی خاص میراث ہے اسے دوسرے گوت چھو بھی نہیں سکتے، گویا جو قوم خود اپنوں کو بھی تبلیغ کرتے ہوئے ڈرتی ہو وہاں دوسری اقوام اور دوسرے وطنوں کو دعوت دینے کا سوال ہی کب پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب تبلیغی مذہب کہلایا جا سکے؟

۳۔ لامی مذہب

لامی مذہب والے یعنی تبت کے لوگ ساری خیر و برکت کا وجود تبت ہی کے

پہاڑوں تک محدود مانتے ہیں اور اس سے باہر جگہ جگہ شیطانی ارواح کا تسلط سمجھتے ہیں، بزعم خود اگر وہ ان حدود سے باہر نکل جائیں تو یہ شیطانی ارواح ان میں حلول کر کے ان کی ساری خیر و برکت سلب کر ڈالیں، چنانچہ اس قوم کے لاما نے جبکہ بلطائف الحیل اسے یورپ کے سفر پر مجبور کیا گیا، واپس آکر اخبارات کو یہی بیان دیا تھا کہ تبت سے نکلتے ہی اسے فضائے آسمانی شیاطین سے بھری ہوئی نظر آنے لگی۔ اور شیطانی ارواح اس میں اور اس کے سارے استعمالی سامانوں میں سرایت کرنے پر تلے ہوئے دکھائی دینے لگے جنہیں بمشکل تمام اس کی روحانیت نے باز رکھا۔ تب وہ تبت کے پہاڑوں کی برکت محفوظ رہ سکی۔

ظاہر ہے کہ ایسا مذہب جو چند پہاڑیوں کے غاروں میں محبوس ہو ساری دنیا کے جبال و بحار تک اپنی تبلیغی گونج کیسے پہنچا سکتا ہے؟ اور کس طرح دنیا کی اقوام کو مسخر کر سکتا ہے؟ کہ اسے تبلیغی مذہب کہا جائے بلکہ اسے یہ حق ہی کب پہنچتا ہے کہ وہ اس تنگ مسلک کی دنیا کو دعوت بھی دے؟ کیونکہ اس کی دعوتِ عام تو عالم کے لئے اسی وقت ممکن تھی کہ سارے عالم کا تبت کے پہاڑوں میں سما جانا ممکن ہوتا۔ اور یہ کب ممکن ہے؟ اس لئے اس قسم کے محدود وطنی یا قومی مذہب جو مخصوص اقوام کے وطنی یا قومی مزاج کے مناسب حال کسی وقت اترے ہوں گے اقوام عالم کے لئے کبھی بھی دعوتِ عام نہیں بن سکتے اور اگر بنائے جائیں گے تو نتیجہ یہی ہو گا کہ اس پھیلاؤ کے بعد خود انہی کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا اور وہ خود بخود معدوم ہونے لگیں گے۔ گویا ان کی بقا کا راز ہی اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنی مخصوص قوم کے حلقوں اور اپنے محدود وطن کی چہار دیواریوں میں نقاب بر سر پڑے رہیں۔

۴۔ یہودی مذہب

اسی بنا پر یہود کو اپنے مذہب کی دعوتِ عام دینے کی جرأت کبھی نہ ہوئی کہ وہ صرف اسرائیلی ہی افتادِ طبع کے مناسب حال تھا۔ یہودی اقوام پیسہ کمانے کے لئے تو دنیا

کے ممالک میں جا سکتی ہیں اور اقوام عالم کا خون چوس سکتی ہیں لیکن مذہب کو لیکر نہیں
چل سکتیں کیونکہ وہ خود جانتے ہیں کہ اگر یہ تنگ مذہب جس میں جنت، رحمت، انبیاء سے
نسبت حتی کہ خدا سے قرابت وغیرہ سب اپنے لیے مخصوص کر کے بقیہ عالم کو محروم القسمت بتایا گیا
ہے اگر اپنی قوم سے آگے بڑھایا گیا تو اقوام عالم تو اس سے زندہ نہ ہوں گی ہاں وہ خود اقوام کی
بھیڑ میں پامال ہو جائے گا اس لیے انہیں اپنی ہی رہبانیت کا ہوں پر مقفل پڑا رہنا چاہیے۔

بہر حال یہ رہبانیت نیز مسائل ومذاہب عموماً یا وطنی حد بندیوں میں جکڑے ہوئے
ہیں یا قومی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں حتی کہ ان کے اسماء ہی سے یہ وطنی، قومی، اور
شخصیتوں کی حد بندیاں اور تنگیاں نمایاں ہیں۔ ہندو مذہب ملک کی طرف، یہودی مذہب
قوم کی طرف اور بدھ مت یا عیسائیت شخصیتوں کی طرف منسوب ہے اس لیے ان کے اسماء ہی
ان کی عمومیت اور ہمہ گیری سے انکاری ہیں۔ پس جبکہ خود ان کے اسم ورسم اور حقیقت و ماہیت
ہی پھیل جانے اور تمام اقوام کے افق پر چمک کر عام روشنی پھینکنے کی صلاحیت نہ ہو تو ان کے
لیے دعوت و تبلیغ کے سسٹم اور آداب تبلیغ کے قواعد وضوابط یا آداب وشروط کا سوال
کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ زیر بحث آئے۔

اسلام اور اس کی عالمگیر تبلیغ

ہاں جو مذہب اپنی تعلیمات اپنے اسم ورسم اپنی نسبت اور اپنی ماہیت اور حقیقت
کے لحاظ سے ہمہ گیر جامع ملل اور ساری دنیا کے لیے ایک پروگرام کی حیثیت رکھتا ہو اور جو
اپنی ذاتی وسعت اور وسعت کے ساتھ کشش عام اور جذب تمام کا حامل ہو گویا جس میں
خود بخود عالم میں پھیل پڑنے کی اسپرٹ موجود ہو وہی اس کا بھی حقدار ہو سکتا ہے کہ اس کی تبلیغ
عام ہو۔ وہ ہر پلیٹ فارم سے پھیلے اور اس میں فن تبلیغ کے قواعد وضوابط کی تعلیم بحیثیت ایک
فن کے دی گئی ہو۔ پس اگر انصاف اور شعور سے کام لیا جائے تو سلسلہ مذاہب میں ایسا

مذہب بجز اسلام کے دوسرا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے جس کے اسم ومعنی اس کی ہمہ گیری کے
شاہد اور اس کی تمام صفات اس کی عالمگیری پر گواہ ہوں۔ چنانچہ جیسے اسلام کا لفظ کسی
وطن یا شخص کی طرف منسوب نہیں ایسے ہی اس کے دوسرے صفاتی نام مثلاً سبیل رب، صراط مستقیم
صراط اللہ اور حنفیت وغیرہ بھی پکار پکار کر اعلان کر رہے ہیں کہ وہ نہ کسی ملک اور وطن کی میراث
ہے نہ کسی مخصوص قوم کی جاگیر ہے اور نہ کسی انسانی شخصیت کی پرستاری اس کا موضوع ہے
بلکہ اس کے ان اسماء ہی سے بجائے وطنیت، قومیت اور شخصیت کے اس کا عالمگیر اور ہمہ گیر
ہونا صاف ظاہر ہے بلکہ اگر اسلام نے کسی موقع پر اپنے آپ کو کسی شخصیت کی طرف منسوب
بھی کیا ہے تو ساتھ ہی اس شخصیت کو عالمگیر بتلا کر اس نسبت سے بھی اپنی عالمگیری ہی ثابت
کی ہے مثلاً قرآن نے اسلام کو کہیں کہیں ملت ابراہیم کا لقب دیا ہے تو ساتھ ہی ابراہیم کے
بابت یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (سورۃ البقرۃ)

(اے ابراہیم) میں تجھے تمام انسانوں کا مقتدا بنانے والا ہوں

پس جبکہ وہ شخصیت جس کی طرف اسلام کی نسبت تھی خود عالمگیر اور تمام عالم اقوام کے
لیے مقتدا بنا دی گئی جیسا کہ ہر زمانہ کی قومیں اس امامت کو تسلیم کرتی چلی آرہی ہیں اور اسلام
کے دور میں اس کا ظہور کامل ہوا تو اس نسبت سے بھی اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری ہی کی
شان نمایاں ہوئی پھر جیسا کہ یہ اسلام اپنے اسماء والقاب اور اپنی نسبتوں کے لحاظ سے پھیل
جانے والا مذہب معلوم ہوتا ہے۔ اپنی تعلیمات کی رو سے بھی اس نے اپنی عالمگیری نمایاں
تر کر دی ہے چنانچہ اس نے خصوصیت سے ان تعلیمات کا خاص اہتمام کیا ہے جو اس پھیل
پڑنے اور ہمہ گیر بن جانے میں خاص اثر رکھتی ہوں اور اس کی عالمگیر تبلیغ کے لیے مقتضی
ثابت ہوں مثلاً پھیل پڑنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ وطنی حد بندیوں سے آزاد ہو اور ساری
دنیا اس کا وطن ہو تو حضرت داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جعلت لی الارض مسجدا و طھورا (ابن ماجہ)

"میرے لئے ساری زمین کو مسجد اور ذریعۂ پاکی بنایا گیا ہے"۔

دوسری جگہ سارے عالم کی فتوحات کی بشارت اور ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:۔

ستفتح علیکم ارضون و یکفیکم اللہ فلا یعجز احدکم ان یلھو باسھمھم (مسند احمد)

عنقریب تم پر زمینیں فتح ہوں گی اور خدا تمہارے لئے کافی ہے (مگر) پھر بھی تم میں سے کوئی شخص تیر اندازی (فنونِ جنگ) سے تھکنے نہ پائے۔

ایک جگہ مشرق و مغرب کی فتوحات کی بشارت دیتے ہوئے مسلم حکام کو عدل و احتیاط پر آمادہ فرمایا:۔

ستفتح مشارق الارض و مغاربھا علی امتی الا و عمالھا فی النار الا من اتقی اللہ وادی الامانۃ (ابو نعیم فی الحلیہ)

عنقریب مشرق و مغرب میری امت پر فتح ہوں گے ہاں مگر اس کے حکام جہنمی ہوں گے الا وہ لوگ جو اللہ سے ڈریں گے اور امانت داری سے حقوق ادا کرتے رہیں گے۔

ایک جگہ ساری زمین کے خزانوں پر اسلام کا قبضہ دکھاتے ہوئے فرمایا گیا:۔

اوتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت فی یدی (بخاری، مسلم)

مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں اور خزانے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے۔

دعوتی سفر اور ان کے ترغیبی احکام

[illegible] مسلم قوم جس کے ساتھ اسلام [illegible] وابستہ ہے کسی خاص وطن کی پابند نہیں، ساری دنیا ان کا وطن بنایا گیا ہے۔ کسی وطن کی حد بندی انہیں دوسرے وطن سے نہیں روک سکتی اور سارے عالم میں ان کے پھیل جانے اور ان کے

ہمہ گیر قبضے کی خبر دی گئی ہے جو ظاہر ہے کہ اسلام کو ساتھ لئے رہتے ہی ہو سکتا ہے اس خبر کے ساتھ پھر مسلمانوں کو ساری دنیا میں گھومنے اور سیاحت کرنے کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شرعی طور پر دیا گیا پھر نہ صرف ایک آدھ ہی نوع بلکہ متعدد انواع سفر کے تاکیدی اور ترغیبی احکام صادر فرمائے تاکہ مسلمان ٹھہرے ہوئے گندے پانی کی طرح کسی ایک ہی خطۂ زمین میں پڑے رہنے کے عادی نہ ہو جائیں۔

۱۔ تعلیمی سفر

سب سے پہلے تعلیمی سفروں کی ترغیب بلکہ تاکید فرمائی گئی اور اس لئے کی گئی کہ جب اسلام میں علم کسی قبیلہ یا خاندان کی میراث نہ تھا اور صحابہ کرامؓ ہی کے زمانۂ خیر و برکت میں علم تمام خطوں میں منتشر ہو چکا تھا اس لئے تحصیلِ علم بھی کسی ایک مقام کے ساتھ مخصوص نہیں ظاہر ہے کہ اس صورت میں کمالِ علم بغیر سفر کئے ہوئے اور علمی مراکز میں گھومے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔

ہر فرقے سے ایک گروہ نے اس غرض سے کیوں سفر نہیں کیا کہ وہ دین میں تفقہ پیدا کریں اور جب (تحصیل علم سے فارغ ہو کر) واپس آجائیں تو اپنی قوم کو اللہ کے احکام سے ڈرائیں تاکہ وہ (برے کاموں) سے بچیں۔

۲۔ اخلاقی سفر

پھر عبرت پذیری کے لئے اقوام سابقہ کے آثار اور گزرے ہوئے کھنڈروں کی طرف سفر کا حکم فرمایا گیا تاکہ دلوں میں بے ثباتیٔ دنیا کا نقشہ قائم ہو کر اخلاق میں صفائی کا باعث ہو۔

عمر ناپائیدار کو تہیۂ آخرت میں صرف کرنے کے دواعی دلوں میں قائم ہوں، حب دنیا کم ہو اور حب آخرت بڑھے اور رذائل سے نفس پاک ہو جائے۔ ارشاد حق ہے:۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا۔

کیا یہ لوگ دنیا میں سفر نہیں کرتے تاکہ ان کے لئے سمجھ دار دل اور سننے والے کان حاصل ہوں۔

۳۔ تبلیغی سفر

پھر تبلیغ دین کے سلسلے میں سفروں کا حکم دیا گیا کہ اہل حق طالبوں کے آنے کے منتظر بلکہ خود ہی تشنۂ ہدایت مواقع پر پہنچ کر ہدایت خلق اللہ کا فریضہ انجام دیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے مصر کا سفر کرنے اور فرعون کو راہ حق دکھانے کا ارشاد ہوا۔

اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ۔ (تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حجاز سے عراق پہنچکر نمرود کی اصلاح کا حکم ہوا۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطراف حجاز میں خود بھی تبلیغی سفر کیے۔ اور جگہ جگہ اقطار عالم میں تبلیغی وفود روانہ فرمائے تاکہ عالم کلمۂ حق کے آب حیات سے سیراب ہو سکے۔

۴۔ عباداتی سفر

اسی طرح عباداتی سفروں کی مستقل بنیاد قائم فرمائی حتی کہ خود ایک سفر ہی کو مستقل عبادت قرار دیا جیسا کہ سفر حج کہ اس میں چلنا پھرنا، گھومنا دوڑنا اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنا ہی عبادت ہے حتی کہ خاص مکہ کا باشندہ بھی حج کو بلا سفر اختیار کیے ادا نہیں کر سکتا کہ یہ عبادت ہی عین سفر ہے جسے عمر بھر میں ایک دفعہ فرض عین قرار دیا گیا ہے۔ گویا ہر مسلمان پر مذہبا ایک دفعہ سفر فرض کر دیا گیا ہے۔

۵۔ جہادی سفر

اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر ہی جنگی سفروں کا حکم دیا گیا اور کسی ایک خطہ کا نہیں بلکہ پوری زمین کا جہاں بھی ضرورت محسوس ہو اور اسباب مہیا ہو جائیں اور پھر ان سفروں میں مزید سہولت کرنے کے لئے نماز بھی آدھی فرما دی گئی۔

ارشاد ربانی ہے:۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ۝

"اور جب تم سفر میں ہو تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے کہ تم نمازیں قصر کرو۔ اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ کافر تم کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے کوئی شبہ نہیں کہ کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔"

دوسری جگہ اس سفر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے اختیار نہ کرنے پر ملامت فرمائی گئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝

اے ایمان والو! تم کو کیا ہو گیا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں سفر کرو تو بھاری بھرکم بن جاتے ہو۔ کیا تم دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے ہو (اگر ایسا ہے تو یاد رکھو) آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کچھ نہیں مگر کم۔

۶۔ تجارتی سفر

تجارتی سفروں کی بنیاد رکھی گئی جو محض روٹی کمانے اور رزق ڈھونڈنے کے لئے کیے جائیں۔

اور ایسے سفروں کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشاد ہے

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ ۔

یہ وہی خدا ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے ذلیل کر دیا ہے اب تم اس کے کاندھوں پر سوار ہو کر چلو پھرو اور اللہ کا رزق کھاؤ۔

غرض سفروں کی مختلف انواع ہیں جن کو امت کے مختلف طبقات نے اپنے مناسب حال اختیار کیا، طلبہ نے تعلیمی سفر کئے، صوفیا نے اخلاقی سفر کئے، مبلغین اور واعظوں نے تبلیغی سفر کئے، مجاہدین نے جہادی سفر کئے اور تاجروں نے تجارتی سفر اختیار کر کے ہر نہج سے ہر ایک طبقہ نے اسلامی خدمات انجام دیں۔ بہر حال زمین کے خطوں میں سفر کرنے، بحر و بر ناپنے اور سارے عالم کی مشارق و مغارب میں گھومنے پھرنے کی ان ہدایات بلکہ تاکیدات سے صاف واضح ہے کہ اسلام اور مسلمان جغرافیائی وطنیت کا قائل نہیں ہے اگر وہ وطن پرور ہے تو بایں معنیٰ کہ ساری دنیا اس کا وطن ہے۔

پھر جیسے ہمیں وطنیت نہیں ایسے ہی کوئی اصطلاحی قومیت بھی اس کے دامن کو داغدار کئے ہوئے نہیں ہے وہ کسی نسل، کسی قبیلہ اور کسی رنگ کا پابند نہیں، بلکہ ساری دنیا کی اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے قوم واحد بنانے کے لئے آیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا۔

وہ خدا بڑا برکت والا ہے جس نے اپنے بندہ پر قرآن مجید نازل کیا تاکہ وہ تمام عالم والوں کے لئے نذیر بن جائے۔

حدیث نبوی میں ارشاد ہے:۔

بعثت الی الناس کافۃ بعثت الی الاسود والاحمر۔

"میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں میں کالے اور گورے سب کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔"

ان آیات اور روایات سے واضح ہے کہ اسلام، وطن، نسل، قوم، رنگ وغیرہ کی یہ سب قیدیں اٹھا کر چاہتا ہے کہ اس کا پیغام تمام عالم کو پہنچ جائے چنانچہ جگہ جگہ تبلیغ و دعوت، موعظت تذکیر، نصیحت، امر بالمعروف، ہدایت، ارشاد وغیرہ کے عنوانات سے اس نے اس پروگرام کو پھیلانے اور دنیا کے چپے چپے تک پہنچا دینے کی مؤکد ہدایات فرمائی ہیں۔ جس سے واضح ہو گیا کہ اسلام ہی میں پھیل جانے، عام ہو جانے اور عالمگیر بن جانے کی صلاحیت بھی اس لئے اسی نے اپنا مقصد دعوت عام رکھا اور اس لئے اسی مذہب کو جامع اور اجتماعی مذہب کہا جائے گا اور اسی لئے یہی تبلیغی کہلائے جانے کا بھی مستحق ہے اور اسی بنا پر صرف اسی میں طرق تبلیغ پر ایک فن کی حیثیت سے بحث ہونی چاہیے۔

غور کریں تو اس آیت دعوت نے اسلام کی جامعیت اور احاطہ کلی کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ آیت میں جب اسلام کو بنام سبیل رب مدعو الیہ (دعوتی پروگرام) ٹھہرا کر اس کی طرف ادع سے دعوت دینے کا امر کیا تو اس کا مفعول ذکر نہیں کیا کہ کن کو دعوت دیں، اور یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربیت کے قواعد کے مطابق ایسے مواقع میں مفعول کا ذکر نہ کیا جانا اس کے عام ہونے کی دلیل ہوتی ہے تو حاصل یہ نکلا کہ سبیل رب کی دعوت ہر اس شخص کو دو جس میں فہم خطاب کا مادہ ہو یعنی ہر ایک عاقل، بالغ انسان کو تبلیغ کرو اور ظاہر ہے کہ دعوت عام دینا اور ساری دنیا کو اس دعوت کا مدعو ٹھہرا دینا جب ہی ممکن ہے کہ خود دعوتی پروگرام میں بھی عموم و ہمہ گیری کی صلاحیت ہو ورنہ امر عام عبث ٹھہر جائے جو کلام الٰہی میں محال ہے اس لئے عموم دعوت اور عموم مدعوین مقتضیاً قدرتی طور پر عموم مدعو الیہ ہوتا ہے یعنی دعوت پروگرام بھی بذات خود عالمگیری کی شان رکھتا ہو اس لئے اسلام کا تبلیغی ہونا جامع ہونا اور اجتماعی ہونا اسی آیت کے اقتضاء سے ثابت ہو جاتا ہے۔

بہر حال یہاں تک مدعو الیہ یعنی دعوتی پروگرام کے احوال و اوصاف کے متعلق بحث

حق اور الحمد للہ کہ اس کے پانچ جامع اوصاف تشریعیت یعنی منجانب اللہ ہونا سنیت یعنی اختراعی نہ ہونا، سذاجت یعنی بے تکلف اور سادہ ہونا، عمومیت یعنی ہمہ گیر ہونا اور اجتماعیت یعنی اس کے کاموں کا جماعتی رنگ میں ہونا سب اس آیتِ دعوت سے ثابت ہو گئے۔

دعوت کی قسمیں

مدعو الیہ یعنی دعوتی پروگرام کی تشریح کے بعد اب نفسِ دعوت کا مقام آتا ہے کہ ایسے جامع پروگرام کو پہنچانے کے لئے دعوت و تبلیغ کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے اور کس انداز سے دعوت دی جائے کہ دنیا کا ہر فرد بشر اس پروگرام کی طرف مائل ہو جائے آیا محض پروگرام پیش کر دینا کافی ہے یا پیش کرنے کا کوئی ڈھنگ بھی مطلوب ہے؟ تو اس کے متعلق بھی اسی آیتِ دعوت نے کافی روشنی پیش کی ہے۔ دعوت کے طریقوں اور انواع پر روشنی ڈالتے ہوئے آیتِ کریمہ نے بتلایا ہے کہ دعوتِ الی اللہ اصولاً صرف تین طریقوں پر منحصر ہے جس کی دلیلِ حصر یہ ہے کہ مذہبی دعوت و تبلیغ جب تک کسی حجت و دلیل پر مبنی نہ ہو ظاہر ہے کہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتی اور حجتِ بیانی کی عقلاً دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ حجت اپنے مذہب کی تحقیق و اثبات کے لئے لائی جائے۔ دوسرے یہ کہ مخالف پر الزام قائم کرنے کے لئے استعمال کی جائے تاکہ وہ لاجواب اور ساکت ہو جائے۔ اگر تحقیقِ مذہب کے لئے استعمال کی گئی ہے تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں یا یہ حجت ایسی قطعی اور یقینی ہو کہ مخاطب کے دل میں یا دل دہلہ یقین و انشراح کی کیفیات پیدا کر دے اور یا ایسی قطعی نہ ہو بلکہ محض ظنی ہو جس سے مخاطب کو فی الجملہ کسی حد تک مدعا میں طمانیت اور قناعتِ قلبی پیدا ہو جائے۔

۱۔ حکمت

پہلی نوعیت کے ساتھ اثباتِ مذہب کرنا جو مخاطب کے دل میں مذہب کے

متعلق یقین اور قطعیت پیدا کر دے حکمت کہلاتا ہے۔

۲۔ موعظت

دوسری نوعیت کی حجت سے اثباتِ مذہب کرنا جس سے مذہبی عقائد کی حقانیت کے متعلق ظنِ غالب دل میں بیٹھ جائے اور اس کی مخالف جانب مضمحل اور ناقابلِ شمار ہو کر مغلوب و مستور ہو جائے موعظت کہلاتا ہے۔

۳۔ مجادلت

اور تیسری نوعیت کی حجت کے ساتھ مخالف کے سامنے آنا اور اتمامِ حجت کے ساتھ الزامی جوابات سے اسے ساکت اور لاجواب کر دینا مجادلت کہلاتا ہے۔

اس تقسیم سے تبلیغِ حق کی انواعِ سہ گانہ مشخص ہو گئیں، حکمت، موعظت اور مجادلت قرآن کریم نے ان کو پاکیزہ اسلوب پر لانے کے لئے ان کے اوصاف کی طرف بھی واضح اشارے فرمائے ہیں جس سے یہ انواعِ دعوت مخاطبوں کے دلوں میں گھر کر سکیں گویا قرآن نے تنبیہ کی ہے کہ حجت بیانی کے ان تینوں طریقوں میں اسلوب اور روش پاکیزہ ہونی چاہیئے بے ڈھنگا پن نہ ہو۔ بالخصوص مجادلہ و مناظرہ کہ جس میں معاملہ دشمنوں اور معاندوں سے پڑتا ہے جو اثناءِ بحث میں اپنی اشتعال انگیزیوں سے اس کی خاص سعی کرتے ہیں کہ مناظرِ اسلام جوش میں آکر آپے سے باہر ہو جائے اور کچھ کا کچھ کہنے لگے تاکہ بجائے مقابل کے وہ خود ساکت کیا جا سکے اس لئے مناظر کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا تاکہ دشمن پر اتمامِ حجت ہو جائے اور مناظر کی کسی حرکت سے مذہب اور مذہبی استدلال کو صدمہ بھی نہ پہنچنے پائے اس لئے مجادلہ کو پاکیزہ ڈھنگ پر لانے اور اس میں حسن و خوبی پیدا کرنے کے لئے قرآن نے تین لفظ استعمال فرمائے ہیں بالتی، ھی اور احسن یعنی مجادلہ اس روش پر ہو کہ وہ روش بہتر سے بہتر ہو اور یہ عربیت

کثرت المبانی تدل علی کثرت المعانی والفاظ کی کثرت معانی اور مقاصد
کا مانا ہوا قاعدہ ہے کہ
کی کثرت کی دلیل ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جب یہاں معنی ومقصد حسن مجادلہ ہے تو یہ الفاظ کی کثرت
اسی حسن ہی کی زیادتی وکثرت اور تاکید در تاکید کے لیے ہو سکتی ہے اب حاصل یہ ہوگا کہ اپنے
مجادلہ میں حسن در حسن پیدا کرو کیونکہ سابقہ دشمن معاند سے ہے۔ جسے رام کرنا ہے تو کوئی
ادنی بے ڈھنگا پن بھی نہ ہونا چاہیئے کہ اسے دین یا مناظر دین کی ہوا خیزی کا موقع ملے۔
ادھر موعظت میں سابقہ اپنوں سے ہوتا ہے دشمنوں سے نہیں اس لئے اس میں کسی
خاص اہتمام کی ضرورت نہ تھی البتہ یہ ضرور تھا کہ موعظت کی تاثیر پیرایہ بیان کی عمدگی سے ہو
سکتی ہے کہ عنوان دلچسپ ہوتا کہ مخاطبوں پر اثر پڑے گویا موعظت میں حسن پیدا کرنے کے
لیے نہ تو اتنی تاکید کی ضرورت تھی کہ کئی کئی الفاظ سے اسے مضبوط کیا جاتا اور نہ اسے حسن و خوبی
سے معرّیٰ چھوڑ دیا جانا ہی مفید تھا کہ کوئی لفظ بھی حسن موعظت پر دلالت کرنے والا نہ لایا جاتا
بلکہ اس حقیقت کے پیش نظر کہ جب موعظت کا پیرایہ بیان اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی اور ممکن
تھا کہ اس آیت کا مخاطب ہر اچھی بری اور ڈھنگی یا بے ڈھنگی موعظت میں اپنے کو آزاد
سمجھتا اس لئے موعظت کے ساتھ صرف حَسَنَۃ کی ایک قید لائی جانی کافی سمجھی گئی تاکہ واعظ
اور مذکر مضمون وعظ کو ذہن میں مرتب کر کے خوبصورت اور مؤثر پیرایہ میں ادا کرے۔
ادھر حکمت میں سابقہ عقلاء اور تحقیق پسند حضرات سے پڑتا ہے جن سے اشتعال انگیزی
یا تمسخر یا استہزاء کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا وہ اپنی حکمت پسندی سے ہمہ تن صرف حکمت ہی سننے
کے متلاشی ہوتے ہیں نہ کہ متکلم کی ذات یا مسلک پر حملہ کر کے اسے مشتعل کرنے کے اس لئے
ان سے تخاطب کے وقت ضرورت صرف ایسے ہی کلام کی ہو سکتی تھی جو بذاتہ اعلیٰ اور پاکیزہ ہو
کہ اسے جس پیرایہ میں بھی پیش کرو دلپذیر ہی ہو اور یہ شان حکمت وحقائق ہی کی ہوتی ہے
کہ وہ پیرایوں کی خوبصورتی اور عنوانوں کی شوخی کی محتاج نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان میں خود بذاتہ ایک
کشش اور دلپذیری ہوتی ہے جو انہیں عنوانوں سے مستغنی رکھتی ہے حتی کہ حقائق بیانی میں

عنوانات کو آراستہ کرنے کی فکر کی جائے تو بسا اوقات کلام بھدا اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔
اس لئے یہاں حکمت کے ساتھ حسن کی کوئی بھی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی کہ حکمت کبھی بھدی اور
غیر حسن ہوتی ہی نہیں کہ اسے حسنہ اور غیر حسنہ کی طرف منقسم کیا جائے نیز اس کے مخاطب ایسے نامعقول
ہوتے ہی نہیں کہ ان کے خیال سے کلام حکمت کی لفظی آرائش وزیبائش کی فکر کی جائے۔

خلاصہ یہ کہ مناظرہ جبکہ بہت اچھا بھی ہو سکتا تھا اگر ڈھنگ سے ہو اور بہت برا بھی ہو سکتا
تھا اگر جذبات درمیان میں آ جائیں اس لئے اس کی بہت برائی کے دفعیہ اور بہت خوبی کی
تحصیل کے لئے تین تاکیدی کلمات آئے، بالتی، ھی، احسن، ادھر موعظت جبکہ
کبھی اچھے ڈھنگ پر ہوتی تھی کبھی برے رنگ پر اس لئے اس کی مطلق برائی رفع کرنے اور اسی
درجہ کی خوبی پیدا کرنے کے لئے اس کی صرف ایک صفت حَسَنَۃ پر قناعت کی گئی۔ ادھر حکمت
جبکہ سرتاپا خوبی تھی اسے صفات کے ذریعے اچھا بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لئے یہاں حکمت
کے ساتھ کسی صفت کو لانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

عملی دعوت

پھر قرآن میں دعوتِ الٰہی کے ان تین طریقوں حکمت، موعظت، مجادلت کے ساتھ
کیونکہ کوئی قید اور تخصیص مذکور نہیں اس لئے یہ تینوں دعوتیں اپنے عموم اور اطلاق پر باقی
رہیں گی اور دعوت وتبلیغ کا عموم یہی ہو سکتا ہے کہ خواہ وہ قولی ہو یا فعلی یعنی مبلّغ خواہ زبان
سے حق کی دعوت دے یا اپنے کسی طرزِ عمل سے دونوں کا ڈھنگ ایسا ہونا چاہیئے کہ مخاطبوں
کے دلوں میں حق سرایت کر جائے اور وہ حق کی طرف جھک پڑیں گویا جس طرح مبلغ کے حسن بیان
سے مخاطبوں کے شبہات رفع ہوتے تھے اور حق وصداقت پر قناعتِ قلبی اور طمانیت پیدا ہوتی
تھی اسی طرح اس کا طرزِ عمل بلکہ ہر نقل وحرکت بھی تبلیغی ہی ہونی چاہیئے جس سے لوگ جوق در جوق
دائرہ حق میں داخل ہو جائیں، عملی حکمت سے ان کے دلوں میں دین پر وثوق وایقان پیدا ہو۔

عملی موعظت سے ان میں قناعتِ قلبی قائم ہو اور عملی مجادلت سے ان کے شکوک و شبہات کا قلع قمع ہو جائے۔

اس لحاظ سے دعوت کی یہ سہ گانہ قسمیں نظری اور عملی کی طرف منقسم ہو کر چھ ہو جائیں گی حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی۔ موعظتِ نظری اور موعظتِ عملی، مجادلہ نظری اور مجادلہ عملی۔ دعوتِ قولی کی تینوں قسموں کی تفصیلات ابھی ابھی گذر چکی ہیں جن میں حکمت و موعظت اور مجادلت کا علمی اور فکری پہلو واضح کیا گیا تھا جو مخاطب کو مبلغ کے سامنے اور بھی زیادہ سرنگوں کر دیتی ہے۔

مثلاً حکمتِ عملی کے تحت میں انبیاء علیہم السلام کے معجزات، اولیائے کرام کی کرامات صلحاء کے اصلاحی رنگ ڈھنگ ایسے اونچے دلائل ہیں کہ تاثیر عام میں ان کا مقابلہ فکری دلائل نہیں کر سکتے عملی میدان میں ایک چیز محض کہی جاتی ہے اور عملی میدان میں اسے کر کے دکھایا جاتا ہے ظاہر ہے کہ مشاہدہ کا جو اثر ہو سکتا ہے وہ محض کہنے سننے کا نہیں ہو سکتا۔

عملی نصیحت

موعظتِ عملی کے سلسلے میں ایک داعیِ دین نے اپنے ایک متوسل کے دل سے حسنِ صورت کی محبت مٹانے اور حسنِ سیرت کی محبت قائم کرنے کے لئے زبان کے بجائے عملی حکمت سے اس طرح کام لیا کہ ایک لڑکی کو جوان کے ایک متوسل کی منظورِ نظر ہو گئی تھی اور ذکر اللہ میں خارج ہوتی تھی مسہل دوائیں کھلا کر زرد رنگ بد ہیئت اور بے انتہا لاغر کر ڈالا پھر اس متوسل کے پاس امتحاناً بھیجا متوسل نے معمولِ سابق کے خلاف بجائے میلان کے اعراض اور تنفر اختیار کیا اور نگاہ بھر کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ شیخ نے یہ کیفیت دیکھ کر متوسل کو ان فضلات و نجاسات پر لا کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ یہ ہے آپ کا محبوب: لڑکی آپ کی محبوبہ نہ تھی کیونکہ جب تک اس چھوکری میں یہ نجس و فضلات بھرے ہوئے تھے آپ کو اس سے محبت تھی آج یہ فضلات اس کے بدن سے خارج ہو گئے تو آپ کو نفرت ہو گئی اس لئے

آپ کا محبوب یہ لڑکی نہیں ہے کہ اس کی ذات تو اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ یہ بول و براز ہے اس سے طالب کو عبرت اور ہدایت ہوئی اور اس کا دل صورتوں کی محبت سے پاک ہو کر سیرتوں کا طالب بن گیا۔ پس یہ موعظت تھی مگر عملی اور علمی سے کہیں زیادہ مؤثر جس نے ایک دم اس مرید کے دل کی کایا پلٹ دی۔

مجادلۂ عملی

مجادلۂ عملی کے سلسلے میں حضرت شبلیؒ کے زمانے میں دہریوں نے قرآن کی اس آیت کو رد کرتے ہوئے کہ روح امرِ الٰہی کا نام ہے یہ دعویٰ کیا کہ روح خون کی حرارت اور بخارِ لطیف کا نام ہے جس سے آدمی زندہ ہے۔ زندگی اور روح کو امرِ الٰہی سے کیا تعلق؟ شیخ نے بجائے علمی مناظروں کے اسی وقت بر سرِ مجمع اپنی شہ رگیں کٹوا کر سارا خون نکلوا دیا اور پھر کھڑے ہو کر فرمایا کہ اب میں کیوں زندہ ہوں جبکہ مجھ میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں ہے؟ کیا اب بھی اس میں کوئی شبہ ہے کہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي زندگی محض امرِ الٰہی سے قائم ہوتی ہے خون سے نہیں۔ یہ مجادلہ تھا مگر عملی اور علمی مجادلے سے کہیں زیادہ مؤثر، کیونکہ اب تک کے فلسفیانہ مناظروں سے ادھر تو لوگوں کے شبہات میں اضافہ ہو رہا تھا اور ادھر دہریوں کی آواز کو پھیلنے کا موقع مل رہا تھا لیکن شیخ کے اس عملی مجادلہ سے دہریوں کی شہ رگ کٹ گئی اور شبہات زدہ لوگ سب کے سب ہدایت پر آ گئے۔

حکمتِ عملی

حکمتِ عملی کے سلسلے میں بعض مشائخ کے سامنے چند فلسفی مزاج لوگوں نے کلامِ الٰہی کی جھاڑ پھونک اور دعا کے مؤثر ہونے کا انکار کیا۔ شیخ نے بجائے قولی تفہیم کے انہیں تیز کلامی کے ساتھ چند تہذیب سے گرے ہوئے جملے کہہ ڈالے جس سے یہ فلسفی غیظ و غضب

اور انبساطی جوش میں آ گئے، اُن کے بدن کپکپانے لگے اور خون کھول جانے سے چہرے تمتما اُٹھے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ نے ان کی تعریف میں کچھ غیر معمولی اور مبالغہ آمیز کلمات کہہ دیئے جس سے وہ پہلا اثر زائل ہو کر ایک نیا اثر انبساط اور نشاط کا پیدا ہو گیا۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ تم سمجھے کہ میں نے کیا کیا؟ یہ میں نے تمہیں عملی جواب دیا ہے۔ تم غور کرو کہ میرے چند کلمات نے جو درحقیقت واقعیت بھی لئے ہوئے نہ تھے تم میں اس قدر ہیجان اور انقلاب عظیم بپا کر دیا کہ تمہارے چہرے سفید سے سرخ اور سرخ سے سفید ہو گئے۔ تمہارے بدن ساکن سے متحرک اور متحرک سے ساکن ہو گئے۔ اندرونی قویٰ میں انبساط سے انقباض اور انقباض سے انبساط پیدا ہو گیا۔ اور تمہارے نفسانی نظام میں ہیجان بپا ہو گیا تو کیا خدا کا پاک کلام جو حقیقتاً روحِ حیات ہے بدن اور روح میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا کہ آدمی صحت سے مرض اور مرض سے صحت کی طرف لوٹ آئے اور اس کی طبیعت اس درجہ نشاط و قوت کا اثر قبول کر لے کہ خود ہی مرض کو دفع کرنے میں کامیاب ہو جائے؟ پس یہ حکمت تھی مگر عملی جو حکمتِ نظری سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔

بہر حال حجتِ بیانی کے یہ تینوں طریقے قولی یا نظری کی قید سے مقید نہ تھے بلکہ نظری اور عملی دونوں کو عام تھے اس لئے جہاں دعوتِ قولی کی یہ تین قسمیں اسی آیت سے ثابت ہوئیں دعوتِ عملی کی بھی یہی تینوں قسمیں اسی آیت سے ثابت ہوئیں اور اگر دعوتِ نظری مع اپنی تینوں قسموں کے مبلغ کے لئے ضروری ہے تو دعوتِ عملی بھی مبلغ کے لئے اسی آیت سے ضروری ثابت ہوئی۔

مخاطب کے مزاج اور ذہنیت کی رعایت

دعوتِ الی اللہ کے یہ چھ طریقے اور اصول جبکہ اس سے وضع کئے گئے کہ مخاطبوں کی قسمیں بھی دنیا میں اتنی ہی تھیں تو اس سے ایک اصول خود نکل آیا اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ کو محض

تبلیغ ہی مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ مخاطبوں کے احوال اور طبائع کی رعایت بھی منظور ہے۔ جس کا منشا شفقت ہے۔ اگر بنی آدم کے مزاجوں اور ذہنیتوں کی رعایت ملحوظِ خاطر نہ ہوتی تو صرف احکامِ الٰہی کا پہنچا دیا جانا کافی سمجھا جاتا، استدلال کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی چہ جائیکہ استدلال کی انواع و اقسام پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی پس جبکہ انسانوں کے داعی اوّل حق جلِ مجدہ نے اپنے مخاطبوں کی یہ رعایت فرمائی تو اس سے آیت کا منشا صاف طور پر واضح ہوا کہ تمام داعیانِ دین کا فرض ہے کہ وہ رعایتِ طبع کے ماتحت مخاطبوں کی ذہنیتوں کا اندازہ کر کے تبلیغ کا آغاز کریں ورنہ بلا رعایتِ طبائع ان کی دعوت و تبلیغ مؤثر نہیں ہو گی۔ اس ثابت شدہ کلیہ کے ماتحت رعایتِ طبع کی جس قدر بھی جزئیات ہوں گی وہ سب اسی آیت سے ثابت شدہ مانی جائیں گی۔

داعی کی فصاحت و بلاغت

چنانچہ اس کلیہ کا فرد یہ ہے کہ مبلغ اپنے کلام کو فصاحت و بلاغت سے آراستہ کرے خواہ وہ حکمت سے کام لے یا موعظت اور مجادلہ کے میدان میں آئے۔ بہر حال شستہ کلامی، فصاحتِ لسانی اور بلاغتِ بیانی اس کا خاص شعار ہونا چاہیئے تاکہ مخاطب صحیح عنوان سے صحیح مقاصد ہی اخذ کر سکے۔ اگر کلام میں پیچیدگی اور بے ترتیبی ہو یا کلام ان محاورات کے مطابق نہ ہو جس کے اہل لسان خوگر ہوں تو مخاطب صحیح اثر قبول نہ کر سکیں گے اور کلام رائیگاں چلا جائے گا۔ اس لئے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ مقتضائے حال کے مناسب ہو، زمانہ اور وقت کی زبان میں ہو، اور ایسے عنوان سے ہو جو لوگوں میں معروف اور متعارف ہو، غریب لغات، ناشستہ تعبیرات اور بے محاورہ کلام نہ ہو ورنہ کلام میں نہ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے نہ تاثیر۔ اس لئے حدیثِ نبوی ﷺ میں اس قسم کے کلام کی صریح ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الاغلوطات (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے پیچیدہ اور مغالطہ انگیز کلام سے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے کی یہ کہہ کر درخواست کی کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں اور میری تقریر کی تائید میں جب وہ رواں اور صاف تقریر کریں گے تو قلوب پر اچھا اثر پڑے گا ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میری رکتی ہوئی زبان سے لوگ برا اثر نہ لیں اور تکذیب کے درپے نہ ہو جائیں۔ ارشاد حق ہے۔

وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۔ (القصص)

اور اے میرے رب، میرے بھائی ہارونؑ کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے تو اگر ان کو میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دے کہ وہ میری تقریر کی تائید اور تصدیق کریں گے ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون اور اس کے درباری) میری تکذیب نہ کریں۔

اس واقعہ سے واضح ہے کہ کلام مخاطبوں کی ذہنیت کے مناسب ہو کر ہی اثر انداز ہوتا ہے گویا شہروں میں ادبی زبان، دیہات میں معمولی اور سادہ زبان، علمی طبقوں میں اصطلاحی زبان اور اہل فنون کے طبقہ میں فلسفیانہ زبان ہی مفید اور مؤثر ہو سکتی ہے۔

مضامین کا تنوع

پھر مخاطبوں کی رعایت کے سلسلے میں مبلغوں پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کو مختلف قسم کے مضامین سے آراستہ کر کے پیش کریں اس میں وعدے بھی ہوں اور وعیدیں بھی، بشارتیں بھی ہوں اور تخویفیں بھی، ترغیب بھی ہو اور ترہیب بھی، صفت جنت بھی ہو اور احوال نار بھی، فضائل بھی ہوں اور احکام بھی، قصص بھی ہوں اور عبر و امثال بھی، حکم و اسرار بھی ہوں اور علمی لطائف و ظرائف بھی۔ غرض جو قرآن کریم کا طرز خطاب ہے اسی کے نقش قدم پر یہ دعوت بھی

مختلف الالوان مضامین پر مشتمل ہونی چاہیئے تاکہ نو بہ نو مضامین سے مخاطبوں کے شوق کی تجدید ہوتی رہے ورنہ ایک ہی نوع کے مضامین سے مخاطب تنگ آکر اکتا جائیں گے اور تبلیغ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

مثلاً نوعیت بیان یہ ہونی چاہیئے کہ اولاً اس میں نیکی کے فضائل اور بدی کی مذمت بیان ہو، خواہ وہ نیکی بدی عبادات کے دائرہ کی ہو یا عادات کے۔ معاشرت کی ہو یا معیشت خانگی کی، تدبیر منزل کی ہو یا سیاست مدن کی۔ جب مخاطبین ادھر جھک جائیں تو پھر ذکر اللہ اور اطاعت کی مثالیں پیش کی جائیں، جب اس درجہ پر آکر ان کا شوق بھڑک اٹھے تو پھر انہیں ضبط لسان اور حفاظت قلب کی تلقین کی جائے کہ اسے برے خیالات اور گندے اخلاق کا ظرف نہ بنائیں، زبان کو سب و شتم، غیبت و چغلی اور فضول گوئی سے آلودہ نہ کریں پھر اس مقصد پر مخاطبوں کو ابھارنے کے لئے سلف کی پاکبازانہ زندگیوں کے واقعات ذکر کئے جائیں، تاریخی حوالے پیش کئے جائیں، مہذب قوموں اور متمدن قرنوں کے احوال سنائے جائیں۔ ان کے نیک انجام پر روشنی ڈالی جائے، نیز عبرت کے لئے بدکار اقوام کا انجام بد دکھلایا جائے پھر لمبی چوڑی امیدوں اور غفلتوں کو توڑنے کے لئے بے ثباتی دنیا اور زندگی کی ناپائیداری کا ذکر کیا جائے کہ یہ سارا عالم قصہ کہانی سے زیادہ نہیں ہے۔ ع

حالِ دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانۂ — گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانۂ

باز پرسیدم بحال آنکہ دردل بر ببست — گفت یا غولیست یا دیولیست یا دیوانۂ

پھر قلوب میں رقت اور رجوع و انابت نیز سامعین میں خوف خدا پیدا کرنے کے لئے موت اور احوال موت کا ذکر کیا جائے کہ فنا کی ساعت قریب ہے، مہلت کم ہے، ہر عمل کا انجام سامنے آنے والا ہے پھر نزع اور قبض روح کے وہ حسی حالات جو سب کی نگاہوں سے گزرتے ہیں سنائے جائیں کہ کس طرح دنیا سے کوچ ہوتا ہے اور کس طرح ایک انسان سارے مرغوبات طبع دم کے دم میں چھوڑ کر اس طرح چل دیتا ہے کہ پھر اس کا کوئی نقش پا بھی دنیا میں

باقی نہیں رہتا ہے۔

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

پھر قبر کی ہولناکی، اس کی دہشت، تنہائی اور بے مونسی کا منظر پیش کیا جائے اور یہ کہ اس کی ہر مصیبت کا تدارک عملِ صالح ہے پھر یوم حساب اور اس کی شدت اور غضبِ الٰہی کا ظہور نام حشر کے ہولناک حوادث، ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کا لرزہ براندام ہونا اور ہر ایک نفس کا اپنی فکر میں غرق ہونا وغیرہ سامنے لایا جائے، پھر جنت و نار، نعیم و جحیم اور رحمت و قہر کے نمونے دکھلائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین سے تبلیغ لبریز ہوگی تو بلاشبہ قلوب میں اثر پیدا کرے گی کیونکہ اس میں طبائع قلوب اور ارواح سب ہی کی رعایت ہوگی۔ جو روح تربیت ہے اور جبکہ مخاطبین کے احوال کی رعایت آیتِ دعوت سے ضروری ثابت ہوئی تو اس قسم کے تمام امور جن کو مخاطبوں کی رعایتِ طبائع میں دخل ہے بلاشبہ آیت کا مقتضا ہو کر اسی سے ثابت شدہ مانے جائیں گے۔

مخاطبوں کی اسی رعایتِ احوال کا یہ بھی تقاضا ہے کہ دعوت و تبلیغ ہر وقت اور ہر روز بلاناغہ نہ کی جائے ورنہ مخاطب اکتا جائیں گے اور آثارِ تبلیغ باطل ہو جائیں گے بلکہ درمیان میں وقفے اور ناغے دے کر تبلیغ کو جاری کیا جائے تاکہ ان کا شوق ہر وقت تازہ بتازہ رہے، چنانچہ شفیق بلخی فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہفتہ میں ہر جمعرات کو وعظ و تذکیر فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ اے ابوعبدالرحمٰن کاش آپ ہمیں ہر روز وعظ سنایا کرتے تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔

اما انه یمنعنی من ذالك انی اکرہ ان امِلکم وانی اتخول علیکم بالموعظة کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بها مخافة السامة علینا (بخاری و مسلم)

مجھ کو ہر روز وعظ کہنے سے یہ بات منع کرتی ہے کہ میں تم کو اکتا دینا نہیں چاہتا میں

وعظ میں وقفے اسی طرح کرتا ہوں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اکتا جانے کے ڈر سے وقفے کرتے تھے۔

غور تو کرو یہ مقصد بھی آیتِ دعوت سے ثابت ہے کیونکہ دعوت و تذکیر کا امر اُدعُ کے صیغہ سے فرمایا گیا ہے جو فعل ہے اور عربیت کے قاعدے سے فعل تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے نہ کہ دوام و استمرار پر۔

گفتگو میں نرمی

اسی رعایت طبائع کے ماتحت یہ بھی ضروری ہے کہ داعی الی اللہ کا کلام نفرت انگیز مضامین سے پاک ہو اس میں افراد یا جماعتوں پر حملہ نہ ہو، توہین آمیز پیرائے نہ ہوں کسی فرد یا جماعت کو اس کا نام لے کر برا نہ کہا جائے، کلام میں تعریض و تلمیح نہ ہو، طعن و تشنیع کا رنگ نہ ہو ورنہ ان قبائح پر مشتمل تبلیغ جانبداری یا بد خلقی پر محمول کی جائے گی جس کا اثر کبھی نہیں ہو سکتا حتی کہ حضرت نے ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بطور نصیحت فرمایا تھا۔

بشّروا ولا تنفّروا ویسّروا ولا تعسّروا وتطاوعا ولا تختلفا۔

خوشخبریاں سنانا، نفرت مت دلانا، آسانی کرنا، سختی مت کرنا، باہم متحد و متفق رہنا اختلاف نہ کرنا۔

تدریج

پھر اسی رعایتِ طبائع کے اصول کے ماتحت مبلغ کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے مخاطبوں کے احوال پر نظر ڈال کر ان کی آمادگی اور صلاحیتِ قبول کی بھی جانچ کرے اور تا بحد قبول ہی انہیں تبلیغ احکام کرے حتی کہ اگر ان کی حالت اس وقت ترکِ تبلیغ کی مقتضی ہو تو اس وقت ترکِ تبلیغ

دموعظت ہی کو مصلحتِ شرعی سمجھے بلکہ ایسی حالت میں یہ ترکِ تبلیغ بھی حکم میں تبلیغ کے ہو گی۔ ورنہ یا آثارِ قبول ظاہر نہ ہو سکیں گے اور یا مبلغ کی طرف سے سوءِ عقیدت پیدا ہو جائے گی جو آئندہ کی توقعاتِ قبولیت کا راستہ بھی بند کر دے گی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک از روئے وحی کعبہ کی تعمیر میں حطیم کا حصہ بھی شامل ہونا چاہیئے تھا کہ وہ جزءِ کعبہ تھا اور آپؐ دل سے چاہتے تھے کہ کعبہ کی موجودہ عمارت ڈھا کر اس کی از سرِ نو تعمیر ہو جس میں حطیم بھی داخل عمارت ہو جائے لیکن محض اس مصلحت سے کہ قوم نو مسلم اور جاہلیت سے قریب العہد ہے کہیں اس تخریب و تعمیر جدید سے حضورؐ پر الزام نہ لگائے کہ یہ کیسے پیغمبر ہیں جنہوں نے پہلے کعبہ ہی پر ہاتھ صاف کیا اور اس سے سوءِ عقیدت پیدا ہو جائے جو آئندہ ہر ایک تبلیغ اور تسلیم و قبول سے قوم کی محرومی کا باعث ہو آپ نے یہ نئی تعمیر ملتوی فرما دی جس سے واضح ہے کہ مقاصدِ شرعیہ کے اجراء و تنفیذ میں مخاطبوں کے احوال کی رعایت ناگزیر اور یہ اندازہ لگا لینا ضروری ہے کہ اس مقصد شرعی (مثلاً تبلیغ) کے قبول کرنے پر ان کی طبائع کس حد تک آمادہ ہیں اور فی الحال ان کے سامنے کتنی چیز رکھنی چاہیئے۔

حتیٰ کہ بعض اوقات مخاطب کو ایک صریح معصیت میں مبتلا دیکھتے ہوئے بھی محض اس مصلحت سے نصیحت ترک کر دی جاتی ہے اور معصیت کو ہونے دیا جاتا ہے کہ مخاطب کی حالت قبولِ نصیحت کے مقام پر پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔

صحنِ نبویؐ میں ایک اعرابی نے پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہؓ نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا گویا نہی عن المنکر پر آمادہ ہوئے آپؐ نے سب کو روک دیا اور اعرابی کی اس ناجائز حرکت کو ہونے دیا کہ اس حالت میں روکنے اور دھمکانے سے اس کا پیشاب بند ہو جاتا اور وہ بیمار پڑ جاتا اس کی فراغت کے بعد تو صحنِ مسجد کو پاک کرا دیا اور اسے بلا کر بہت پیار محبت اور نرمی سے فرمایا کہ اے عزیز مساجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں ان کا موضوع نماز اور ذکر اللہ ہے۔

اعرابی پر اس طرزِ نصیحت کا غیر معمولی اثر ہوا اور بولا کہ آنحضرت صلعم نے نہ مجھ کو مارا اور نہ برا بھلا کہا میں نے آپؐ سے اچھا تو معلّم کبھی دیکھا ہی نہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس رعایتِ طبائع کی بنیاد شفقت و کرم پر ہے گویا رعایتِ طبائع کے کلیّہ میں سے شفقت اور رحمتِ ربانی کا اصول نکلتا ہے کلیہ میں سے ایک اور عمیق کلیہ نکلتا ہے گویا جس طرح دعوتِ الی اللہ کے سہ گانہ طرق کی روح رعایتِ طبائع تھی اسی طرح رعایتِ طبائع کی روح شفقت و رحمت ہے۔ اگر شفقت و رحمت کا اصول سامنے نہ ہو تو رعایتِ طبائع کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی پس رعایتِ طبائع باوجود کلیہ ہونے کے شفقت و رحمت کا جزیہ ثابت ہوئی۔ اصل اصول اور وسیع کلیہ رحمت و شفقت رہا اور ظاہر ہے کہ جب جزیہ کسی نص سے ثابت ہوتا ہے تو اس میں چھپا ہوا کلیہ بالا ولی اس نص سے ثابت ہو جاتا ہے اس لئے دعوتِ الی اللہ کے سلسلے میں مبلغ کے لئے رحمت و شفقت کا اصول بھی اسی آیت سے نکل آیا اور واضح ہو گیا کہ جب تک مبلغ کو اپنے مخاطبوں کے ساتھ شفقت نہ ہو ان کی تبلیغ دلوں میں گھر نہیں کر سکتی۔ اس کا مقتضایہ ہے کہ مبلغ کی تمام تر ہمت صرف یہی نہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنا فرضِ تبلیغ ادا کر کے بری الذمہ ہو جائے اور اس برأتِ ذمہ ہی کو سب سے بڑا مطمحِ نظر سمجھ لے۔ خواہ مخاطب سنے یا نہ سنے اور مانے یا نہ مانے۔ نہیں بلکہ اس کے دل میں باپ کی سی شفقت ہونی چاہیئے کہ وہ مخاطبوں کے راہِ راست پر آنے کی تدبیریں کرے اور دل میں یہ مقصد ٹھہرائے کہ کسی نہ کسی طرح وہ مخاطب کو ہدایت پر لا کر ہی مطمئن ہو گا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس تبلیغی رحمت و شفقت کو انتہائی حدود تک پہنچا دیا تھا اور جب کوئی ہدایت قبول نہ کرتا تو آپؐ رنجیدہ ہوتے، دل میں کڑھتے اور غمزدہ ہو جاتے حتیٰ کہ حق تعالیٰ کو اتنی غیر معمولی شفقت سے یہ کہہ کر روکنے کی نوبت آئی کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ کہیں فرمایا لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ کہیں فرمایا لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ کہیں فرمایا مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ اور کہیں فرمایا إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ

بِالْمُهْتَدِيْنَ۔

حاصل یہ کہ اے پیغمبر کڑھنے یا گھٹنے یا غمزدہ رہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اُن کے اُوپر مسلط نہیں ہیں خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور آپ کا کام تو صرف تبلیغ ہے بہرحال جبکہ مبلغ کے لئے شفقت و رحمت کا اصول اسی آیت سے مستنبط نکلا تو ظاہر ہے کہ شفقت و رحمت کی جس قدر بھی جزئیات ہوں گی وہ بھی سب اسی آیت کے تحت میں آکر اسی آیت سے ثابت شدہ ہو جائیں گی خواہ وہ شفقت لسانی ہو یا شفقتِ قلبی و اخلاقی۔

مثلاً شفقتِ لسانی میں قول کی نرمی آتی ہے جو درحقیقت مبلغ کی تبلیغ کا زیور رہے جس سے تبلیغ آراستہ ہو کر محبوب قلوب بن جاتی ہے اور قلوب کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل آواز کی کرختگی، زبان کی تیزی اور اخلاق کی شدت و غلظت دلوں کو چھیل ڈالتی ہے اور تبلیغ و مبلغ سے بیگانہ ہی نہیں متنفر کر دیتی ہے اسی لئے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت و شفقت کا خصوصی ارشاد تھا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔

آپ اللہ کی رحمت سے ان لوگوں کے لئے نرم ہو گئے ہیں اگر آپ تند زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے متمرد اور باغی کے حق میں نرمی قول کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا۔

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے اس سے نرم باتیں کہو شاید وہ یاد کرے اور خدا سے ڈرے۔

پھر جس طرح مبلغ کے لئے شفقتِ لسانی ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شفقتِ قلبی اور شفقتِ اخلاقی کی ضرورت ہے کہ درحقیقت نرمی زبان، نرمی اخلاق ہی کے تابع ہے ہاں مگر چونکہ نرمی اخلاق کلام کی صفت نہیں بلکہ خود متکلم کی صفت ہے اس لئے اس کی جزئیات داعی الی اللہ کے عنوان کے نیچے آئیں گی۔

دعوت کو مؤثر بنانے کی تدابیر

اسی کے ذیل میں تمام وہ شفقت آمیز تدابیر بھی آجاتی ہیں جو تبلیغ کو مؤثر بنانے اور مخاطبوں کے دلوں کو کھینچنے کے لئے ضروری ہوں مثلاً مبلغ کے لئے ضروری ہوگا کہ مخلصانہ تبلیغ کے ساتھ ایک ایسا ماحول بھی پیدا کر دے کہ جس کے تحت لوگ تبلیغ کی طرف خود بخود جھکتے چلے آئیں اور دائرہ تبلیغ وسیع اور مقبول ہو جائے اس سلسلہ میں چونکہ عام طبائع شوکت پسند ہوتی ہیں اس لئے تبلیغ کو مؤثر بنانے کے لئے مبلغ پر لازم ہے کہ تبلیغ کی پشت پر شوکت و قوت بھی کھڑی کر دی جائے تاکہ شوکت پسندوں کو بھی اس کی طرف جھکنے کے علاوہ چارہ نہ رہے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ تبلیغ عام شروع کرنے سے پیشتر مقام تبلیغ کے بااثر افراد کو مقاصد تبلیغ سے مطلع کر کے ان کی ہمدردی حاصل کر لی جائے تاکہ بااثر اور بارسوخ مقامی افراد کی سرپرستی میں یہ پرشوکت تبلیغ عوام کی توجہ کو جذب کر سکے اور اس کا حلقہ خود بخود وسیع ہو جائے۔

آخر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کیوں فرمائی تھی کہ الٰہی اسلام کو عزت دے، دو میں سے ایک کو حلقہ بگوش اسلام کر کے عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل)، ان میں سے جو بھی تجھے محبوب ہو۔ اس دعا کی غرض و غایت یہی تو تھی کہ اسلام میں کسمپرسی کے بجائے شوکت کے آثار نمایاں ہو جائیں تاکہ شوکت پرست طبیعتیں بھی ادھر جھکنے لگیں اور تبلیغ اسلام بسہولت ممکن ہو جائے اور راستے کے فتنے دفع ہونے لگیں چنانچہ

فاروق اعظم کے اسلام لاتے ہی اسلام مخفی گھروں سے نکل کر میدان میں آگیا اور اس کی تبلیغ میں آثار شوکت اور قوت کے پیدا ہو گئے۔

یا مثلاً تبلیغ کو انفرادی کرنے کے بجائے جماعتی بنا دیا جانا قلوب کو کھینچ لانے میں زیادہ مؤثر ہے فرد واحد کا ایک ہی اثر ہے اور جماعت کا مجموعی اثر کچھ اور ہی ہے اسی لئے قرآن حکیم نے جماعتی تبلیغ کا اسوہ قائم فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے:۔

فَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ۔

اور ان کے سامنے اصحاب قریہ کی مثال پیش کیجیے کہ جب ان کے پاس مبلغ آئے اور جب ہم نے ان کے پاس دو شخصوں کو بھیجا تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا پھر ہم نے ایک تیسرے مبلغ کا اضافہ کر کے ان کو معزز کر دیا اور انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں......

یا مثلاً تبلیغ کو منظم بنانے کی صورتیں کرنا کہ اس کی شاخیں ہوں وہ کسی کر ایک مرکز کی طرف سمٹی ہوئی ہوں اس کا سرمایہ ایک بیت المال کی صورت سے منظم ہو اس کا ایک امیر ہو جس کے احکام کے تحت مبلغین نقل و حرکت کریں وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ قرن اول میں مسجد نبوی مرکز تبلیغ تھی اور وہیں سے جماعتیں اور افراد منتخب ہو کر تبلیغ کے لئے خدا کے ملک میں پھیلتے تھے اور سب کا رجوع اسی قبلہ تبلیغ خطہ اور ذات اقدس نبوی کی طرف رہتا تھا گویا تبلیغ کا مرکز بھی تھا اور محیط بھی جس کے تمام خطوط مرکز کی طرف سمٹے دکھائی دیتے تھے اور پھر مرکز سے محیط کی طرف پھیلتے ہوئے نظر پڑتے تھے اور اس طرح پر کار تبلیغ ایک اعلیٰ نظم کے ساتھ ہو رہا تھا جس نے صرف دو سالہ حیات مدنی میں حجاز اور اس کے ماحول کو دائرہ اسلام میں محصور کر دیا تھا۔ اگر اس قسم کی تدابیر کے ماتحت فرائض تبلیغ ادا کئے جائیں تو لوگ اس پر شوکت تبلیغ کی طرف خود بخود متوجہ ہونے لگیں گے اور ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں لوگوں کو

تبلیغی مقاصد کی طرف آنا سہل ہی نہیں بلکہ طبعاً پسندیدہ اور مرغوب محسوس ہونے لگے گا۔

بہرحال آیت دعوت سے نفس دعوت اور اس کے اوصاف وطرق کے بارے میں یہ ۱۷ امور مستنبط ہوئے مقامات کی ضروری تشریح آیت سے ہو گئی تو اب تیسرا مقام مدعوین کی شرح کا آتا ہے کہ دعوت الی اللہ کے سلسلے میں مخاطبوں اور مدعوین کے اوصاف کیا ہونے چاہئیں یا دوسرے لفظوں میں مبلغوں کو بطور اصول کلی اپنے مخاطبوں کو سب سے پہلے کن اوصاف کی ہدایت کرنی چاہیئے جو آئندہ تبلیغ کو مؤثر اور کارآمد بنا سکیں۔ یا مخاطب کس کس وضع اور قماش کے ہوتے ہیں کہ مبلغ کو ان کی ذہنی رفتار کا خیال رکھنا چاہیئے۔

مخاطب کی قسمیں

ظاہر ہے کہ دعوت کی یہ عرض کردہ انواع سہ گانہ اور ان کے اصناف و اوصاف جبکہ مخاطبوں کے متفاوت حالات کے معیار سے وضع کی گئی ہیں تو اسی سے مدعوین کی اقسام بھی خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ ایک طبعی اصول ہے کہ سامان دعوت مدعو کے مناسب مذاق ہی تیار کیا جاتا ہے پس جبکہ اس دعوتی دستر خوان پر حصر کے ساتھ حجت کی تین نوعیں لا کر چنی گئیں تو یہی اس کی بھی صاف دلیل ہے کہ مدعو بھی دنیا میں تین ہی قسم کے ہو سکتے ہیں تاکہ ہر ایک نوع کے مناسب حجت کی نوع پیش کی جا سکے۔

ایک وہ کامل الاستعداد طبقہ ہے جن کے قلوب روشن ہوں علم کی صادق طلب اور معرفت حق کی سچی تڑپ ان میں بدرجہ اتم موجود ہو اور وہ ہر مدعا میں صرف ایسی پختہ دلیلوں اور حجتوں کے طلبگار رہتے ہوں جو یقینی ہوں اور دلوں میں نور یقین پیدا کر سکیں ظاہر ہے کہ ایسے افراد سے خطاب کی صورت بجز دلائل قطعیہ کے دوسرے نہیں ہو سکتی اور اسی کا نام قرآن کی زبان میں حکمت ہے جو آیت ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ میں مذکور ہے۔

اس کے بالمقابل بلکہ اس کی ضد ایک وہ کج فہم طبقہ ہے جن کی طبیعتوں میں سلامتی اور ذوقِ تحقیق کے بجائے بحث ونزاع اور کج بحثی اور کٹ حجتی کے جراثیم بھرے ہوئے ہوں۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا کمال صرف بولتے رہنا اور خاموش نہ رہنا ہے نہ ان کی بدمذاقی کسی فطری حجت ودلیل کو برداشت کرتی ہے اور نہ انہیں کوئی عقلی استدلال مطمئن کرسکتا ہے۔ اس لئے ان کے حق میں محققانہ کلام سودمند ہی نہیں ہوسکتا بلکہ سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ انہیں صرف ایسا معارضہ اور الزام ہی خاموش کرسکتا ہے جو ان کے مسلمات کی رُو سے ہو اور اسی رنگِ احتجاج کو مجادلہ کہا گیا تھا اس لئے کج بحثوں کے حق میں حکمت کلمہ مفید نہیں ہوسکتا بلکہ صرف مجادلہ جس کے مقدمات اگر مسلمہ فریقین ہوں تو اسی کا نام لسانِ قرآن میں مجادلۂ حسنہ ہے پس قرآن نے مجادلۂ حسنہ کا باب قائم فرمایا تو گویا اس نے یہ بھی بتادیا کہ مدعوین کا ایک طبقہ مجادلہ پسند اغبیار کا بھی ہے جس کے سامنے حکمت کے بجائے مجادلت ہی سے کام لینا چاہیئے۔

پھر ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک بین بین طبقہ ہے جو نہ تو کمالِ فہم اور سلامتیٔ ذوق میں حکماء وعقلاء کی حد تک پہنچا ہوا ہے جس کی تسلی خاطر کے لئے دلائل قطعیہ اور حکمت درکار ہو اور نہ بدذوقی میں اس کا حال اغبیاء اور کج بحثوں کا سا ہے کہ اس کے خاموش کرنے کے لئے الزامی حجت اور مجادلہ کی نوبت آئے بلکہ ایک درمیانی حد میں سادہ فطرت اور خلقی سلامت روی پر ہوتا ہے جس کی تفہیم کے لئے واعظانہ خطابات، اقناعی دلائل سادہ مثالیں، عام فہم لطائف اور عبرت انگیز حکایات ہی کافی ہوتی ہیں۔ قرآن مجید نے اسی طبقہ کے لئے موعظۂ حسنہ کے طرزِ خطاب کو اختیار کرنے کا امر فرمایا ہے۔

بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ اگر حصر کے ساتھ حجت بیانی کے یہ تین ہی طریقے نکلتے تھے۔ حکمت، مجادلت اور موعظت تو اُن کے مقتضا کے مطابق بحجت نیوش حضرات بھی تین ہی طبقوں میں منحصر نکلے۔ عقلاء، اغبیاء اور صلحاء اور ہر ایک طبقہ ایک ایک طریقہ کا مقتضا

نکلا۔ یعنی حکمت عقلاء کو چاہتی ہے، مجادلت اغبیاء کو کھینچتی ہے اور موعظت صلحا کا تقاضا کرتی ہے اس لئے آیتِ دعوت کے ان تین منطوق طرقِ حجت کے متقضا سے مخاطبوں کی یہ تین انواع پیدا ہوکر درحقیقت آیت ہی سے ثابت شدہ نکلیں۔

مخاطبوں کی اس اقتضائی تقسیم سے ان کا وصفِ حسن یہاں سے اور نکلتا ہے جو ان میں بتقاضائے عقل راسخ رہنا چاہیئے اور وہ جذبۂ قبولیت اور تسلیم حق ہے یعنی مخاطب کا جوہر یہ ہے کہ وہ دعوتِ الی اللہ کو سماع قبول سے سُنے اور بشرطِ معقولیت ماننے اور تسلیم کرلینے کا جذبہ اپنے اندر رکھے کیونکہ حق تعالیٰ نے جبکہ حجتِ بیانی کی یہ سہ گانہ قسمیں محض مخاطبوں کے فہم کے تفاوت اور ان کی سمجھ کے مختلف درجات کی وجہ سے فرمائی ہیں تو ان کی غرض وغایت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ مخاطب کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ اور بشرطِ عقل وانصاف وکلمہ حق کو قبول کرنے پر اپنے دلی داعیہ سے مجبور ہوجائے اگر یہ غرض نہ ہوتی تو استدلال اور حجت بیانی اور ان کے مختلف طریقوں کی حاجت ہی نہ تھی محض احکام کا بیان کردیا جانا کافی تھا خواہ کوئی سُنے یا نہ سُنے اور خواہ قبولیت کی اس میں گنجائش اور استعداد ہو یا نہ ہو۔ گویا داعی الی اللہ صرف اس کا مصداق ہوتا کہ ؎

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

اب غور کرو تو سماع قبول کے اثبات سے اس کی ضد جسے سوئے قبول کہنا چاہیئے اور جو قلب میں دعوت کو راسخ نہ ہونے دے مع اپنی تمام اقسام کے اس آیت سے خود بخود منفی ہوجاتی ہے۔

مثلاً قلب کا لہو ولعب اور لاابالی پن۔ قلتِ فکر یا قلبی اعراض اور بے توجہی یا زبان کی بکواس۔۔۔ کثرتِ سوال اور فضول استفسارات یا دور از کار احتمالات وشبہات جو کلام کو رُلانے کے لئے کئے جائیں اور جن کی طبعی خاصیت ہی یہ ہے کہ مخاطب کے دل میں داعی کی بات جمنے نہ دیں اور اس پر کسی حیثیت سے بھی متکلم کا اثر نہ ہونے دیں اس آیتِ دعوت

سے مردود ہو جاتے ہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ الامر بالشئی یقتضی النھی عن ضدہ (کسی شے کا حکم دینا اس کی ضد کی ممانعت کی دلیل ہوتا ہے) سامع کے ان قبیح اوصاف پر قرآن کریم نے جدا جدا بھی روشنی ڈالی ہے۔

مثلاً قلبی اعراض اور بے توجہی پر ملامت کرتے ہوئے ہٹ دھرموں اور متعصبوں کی شان بتائی کہ :-

ولو اسمعھم لتولوا وھم معرضون۔

اور اگر وہ ان کو سنائیں گے تب بھی وہ پشت پھیر کر چلے جائیں گے اس حال میں کہ وہ اعراض کرنے والے ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا :-

بل ھم عن ذکر ربھم معرضون۔

بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرنے والے ہوں گے۔

یا مثلاً شور و شغب کے بارے میں قرآن نے دوسری جگہ منکروں کی یہ خصلت تفصیل سے بیان فرمائی ہے کہ کلام حق کو سرے سے سننے ہی کا ارادہ نہیں رکھتے چہ جائیکہ سماع قبول سے سنتے حتیٰ کہ شور و شغب سے دوسروں کو بھی نہیں سننے دیتے۔ فرمایا۔

وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون۔

اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور شور مچاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ۔

اور مثلاً قلبی لہو و لعب کے بارے میں فرمایا۔

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر حق ویتخذھا ھزوا۔

اور بعض لوگ وہ ہیں جو لغو اور فضول باتیں خریدتے ہیں تاکہ اللہ کے راستے سے بغیر حق کے گمراہ کردیں اور اس کی تمسخر اور استہزاء کی چیز بنا دیں۔

یا مثلاً حدیث میں کثرتِ سوال کی ممانعت فرمائی گئی جو محض قیل و قال کے لئے ہو اور جس سے واقع شدہ شک کا مٹانا مقصود نہ ہو بلکہ شکوک کا واقع کرنا اور تکلیف کلام کو مشکوک بنانا منظور ہو۔

فنھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کثرۃ السوال وعن قیل وقال وعن اضاعۃ المال۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ سوال قیل و قال اور اضاعت مال سے منع فرمایا ہے۔

داعی کے ذاتی اوصاف

اب جبکہ امدعوالیہ (دعوتی پروگرام) دعوت اور مدعو کی اقسام و انواع اور متعلقہ احوال آیت دعوت کے ماتحت روشنی میں آچکے تو اب داعی اور مبلغ کا درجہ آتا ہے کہ اس کے اوصاف اور آداب و شروط پر اس آیت نے کیا روشنی ڈالی ہے اور مبلغین کے لئے کیا کیا ہدایتیں مستنبط ہوتی ہیں؟ چونکہ ہدایت و تبلیغ کی کامیابی بہت حد تک مبلغ کے ذاتی اوصاف ان کے اخلاقی کیریکٹر اور اس کی علمی قابلیت پر موقوف ہے اس لئے اس باب میں داعی کے احوال کا موضوع سب سے زیادہ اہم ہے اور مبلغوں کا فرض ہے کہ اسے زیادہ غور سے پڑھ کر اپنی زندگی کو اس مستنبط دستور العمل پر ڈھالنے کی انتہائی سعی کریں اگر وہ صحیح معنی میں مبلغ بننا اور حقیقتاً اپنی تبلیغ کو مؤثر بنانا چاہتے ہیں ہم نے اسی لئے اس موضوع کو سب سے آخر میں رکھا ہے تاکہ ختم کلام پر یہ موضوع خصوصیت سے قلوب پر اپنا اثر چھوڑ جائے۔

جہاں تک غور کیا گیا اس آیت سے بلا واسطہ یا بالواسطہ دعاۃ امت کے وہ اوصاف جن پر تبلیغ کے مؤثر ہونے کا دارومدار ہے اصولاً دو قسم کے نکلتے ہیں ایک وہ جو مبلغ کی ذات

کے لیے بطور اس کے وصف کے ضروری ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے فعل تبلیغ کے لئے اس میں ناگزیر طریقہ پر ہونے چاہئیں جن کے بغیر اس کے مخاطبوں میں کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۱۔ علم و بصیرت

ذاتی اوصاف کے سلسلے میں سب سے پہلی چیز مبلّغ کے لئے علم و بصیرت ہے جس سے تبلیغ کی اساس قائم ہوتی ہے کیونکہ شرعی مقاصد کی تبلیغی اساس ظاہر ہے کہ جہالت نہیں ہو سکتی۔ جاہل مبلّغ تبلیغ ہی نہیں کر سکتا۔

چہ جائیکہ اس کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کی بحث سامنے آئے۔ کیونکہ تبلیغ کی حقیقت ایصال (پہنچانا) ہے اگر خود مبلغ ہی میں وہ چیز نہ ہو جو پہنچائی جانی چاہیئے تو وہ پہنچا کس چیز کو سکتا ہے؟ اور اگر علم کے درجہ میں ہو لیکن اس کے پہنچانے کا ڈھنگ اسے معلوم نہ ہو تو اس کا پہنچانا کیسے مؤثر ہو سکتا ہے؟

پس حق تعالیٰ نے جب دعوتِ الی اللہ کے تین طریقے حکمت، موعظت اور مجادلت تجویز کئے اور دعوتی پروگرام سبیل رب کو بتلایا۔ گویا سبیل رب موجود نہ ہو تو دعوت کا وجود نہیں ہو سکتا اور حکمت، موعظت اور مجادلت نہ ہو تو دعوت کا ڈھنگ درست نہیں رہ سکتا تو اس کے صاف معنی یہ نکلے کہ مبلغ سبیل ربّ کا عالم بھی ہو جسے وہ پہنچائے اور حکمت و موعظت و مجادلت میں متبحر بھی ہو جس سے وہ اپنا پیام مؤثر بنائے۔ مبلّغ کے حق میں ضروری ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور واعظ یا رسمی لیکچرار نہ ہو بلکہ سبیلِ ربّ کے مسائل اور انواع دلائل کا عالم ہو جسے مناسب وقت حجّت و برہان کے انتخاب کرنے میں جہالت مانع نہ ہو۔

۲۔ فہم و فراست

اور جبکہ سہ گانہ انواعِ حجت کا عالم ہونا مبلغ کے لئے ضروری ہوا۔ اور یہ تین طریقے

تین ہی قسم کی جماعتوں کے لئے تجویز فرمائے گئے۔ جن میں سے ایک ایک طریقہ ایک ایک طبقہ کے لئے مخصوص ہے تو قدرتی طور پر مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ مبلغ میں مخاطبوں کے ان طبقات کی تشخیص کا فہم اور تدبر بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ یہ اندازہ کر سکے کہ آیا اس وقت اس کے مخاطب عقلاء اور فلسفی مزاج لوگ ہیں یا سادہ لوح اور سلیم الطبع اشخاص یا کج فہم اور کج بحث افراد ہیں جن کے مناسب وہ حکمت اور مجادلت کے ڈھنگ کا انتخاب کر سکے۔ اگر وہ ان طبقات اور ان کی ذہنیتوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو گو انواع دلائل کا کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو اس کی تبلیغ کبھی مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجیے کہ آپ کے سامنے بی اے اور ایم اے کے ڈگری یافتہ افراد کا اجتماع ہو جنہیں چوبیس گھنٹے عقلیت ستاتی رہتی ہو اور اس لئے وہ دینی مقاصد کو اپنے اس مذاق کے مناسب دلائل سے فلسفیانہ رنگ میں سمجھنا چاہتے ہوں اور چاہتے ہوں کہ قرآن ان کے سامنے ضرور پیش کیا جائے مگر ان ہی کی زبان میں پیش کیا جائے اگر آپ انہیں واعظانہ خطابیات اور اقناعی دلائل سے سمجھانے لگیں جو ایک خالی الذہن اور تشنۂ ہدایت طالب کے سامنے اختیار کیا جاتا ہے یا الزام پسند طبقہ کے سامنے حکیمانہ حقائق کا اظہار کرنے لگیں یا سادہ لوحوں کو الزامی حجتوں سے عاجز کرنے لگیں تو کیا یہ تبلیغ کوئی اچھا اثر پیدا کر سکے گی؟ نہیں بلکہ صدا بصحرا ثابت ہو گی اور اس کا کوئی بھی اثر مخاطبوں پر نہ پڑ سکے گا۔ بلکہ اس صورت میں سامعین مبلغ کی ذات کے بارے میں بری رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مبلّغ سے حسنِ عقیدت مٹ کر اس کی تبلیغ ہمیشہ کے لئے بے اثر بلکہ مسدود ہو جائے گی۔ گویا نافہم مبلغ اپنی نافہمانہ تبلیغ سے خود تبلیغ کے راستہ میں نادانستہ روڑے اٹکاتا رہتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ مبلغ ہو کر تبلیغ کے لئے کیا عمل جراحی کر رہا ہے؟

بہرحال نافہم عالم اور بے بصر مبلّغ کے علوم و معارف اسی طرح بے محل ضائع

ہوتے رہتے ہیں، جس طرح چٹیل میدانوں میں بارش کہ نہ جذب ہی ہوتی ہے کہ سبزہ اُگے اور نہ جمع ہی ہوتی ہے کہ ذریعہ شادابی بنے ۔ اسی لیے ارشاد نبوی ہے:

کلموا الناس علی قدر عقولھم

لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق کلام کرو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

لاتعلقوا الجواھر باعناق الخنازیر۔

جواہرات خنزیروں کی گردنوں میں نہ باندھو۔

۳- دانش و خلق

پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تبلیغ میں فہم و فراست کے ساتھ دانش و عقل اور اخلاق اسلامی بھی درکار ہیں کہ ان دو جوہروں کے بغیر دعوت الی اللہ کی کوئی ایک نوع بھی اپنے پاؤں نہیں چل سکتی کیونکہ یہ تو پہلے واضح ہو ہی چکا ہے کہ دعوت الی اللہ کے یہ تینوں طریقے حکمت، موعظت اور مجادلت اچھے ڈھنگ سے ہونے چاہئیں جو سامعین کے قلوب میں اچھا اثر پیدا کر سکیں۔ چنانچہ اسی لئے مجادلہ میں بالتی ھی احسن کی قید لگائی گئی، موعظت میں حسنہ کی قید لائی گئی اور حکمت کے لفظ ہی میں حسن و خوبی مرعی رکھی گئی تاکہ کوئی نوع بھی مؤثر حسن و خوبی سے خالی نہ رہے ادھر یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دعوت کا اچھا ڈھنگ اس کے مناسب حال جداگانہ ہے اب اگر غور کیا جائے تو ان میں سے کسی ایک دعوت کا اچھا ڈھنگ بھی بغیر عقل و دانش اور اخلاق حسنہ کے اچھا نہیں ہو سکتا کیونکہ مجادلہ کا اچھا ڈھنگ یہ ہے کہ معاندانہ اور کج بحث مخاطب کے اشتعال انگیز رویہ سے پیشانی پر بل نہ لایا جائے متانت سے اس کی کج بحثیاں سن کر الزامی حجت سے اسے لاجواب بنایا جائے ظاہر ہے کہ یہ بغیر ضبط نفس اور صبر کے جو تمام اخلاق

ہے اور بغیر عقل و دانش کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر مبلغ میں دانش نہ ہو تو الزامی حجت کی طرف اس کا ذہن منتقل ہی نہیں ہو سکتا اور اگر ضبط نفس نہ ہو تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہ سکتا کہ متانت کا مظاہرہ ہو سکے۔

اسی طرح موعظت کو بھی حسنہ بنانے میں عقل و دانش کی ضرورت اس لیے ہے کہ تبلیغ کا مضمون ایسے پاکیزہ عنوان اور ڈھنگ سے بیان کیا جائے کہ سادہ لوحوں کے دل روشن ہو جائیں اور وہ حقیقت کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہو جائیں اور اخلاق کی اس لیے ضرورت ہے کہ ان سادہ لوحوں کی بے تمیزی اور بدویت سے جو عموماً ایسے افراد سے سرزد ہوتی ہے مبلغ پر کوئی اثر نہ پڑے۔

ایسے ہی عقلاء سے خطاب کرنے میں بھی عقل و دانش اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر کلام حکمت اور دلائل بیّنہ ذہن میں منضبط ہی نہیں ہو سکتے اور ضبط نفس یا اخلاق کی اس لیے ضرورت ہے کہ جب بال کی کھال نکالنے والے اذکیاء دقیق دقیق شبہات و سوالات پیش کرتے ہیں عادۃً مبلغ کو ایک قسم کی جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اگر وہ اپنے اخلاق سے اس پر غالب نہ آئے تو اس کا کلام حکمت کسی حکمت پسند کے سامنے ہی نہیں آ سکتا اور اس صورت میں مبلغ آپے سے باہر ہو کر اپنی ساری تبلیغی عمارت کو خود ہی اپنے ہاتھوں سے گرا دے گا۔

پس خطاب اذکیاء و اغبیاء سے ہو یا صلحاء سے بہر صورت نفس خطاب کے حسن میں عقل کی اور مخاطبوں کی خصوصیات کے لحاظ سے ضبط نفس اور حسن خلق کی ضرورت ہے ورنہ اس کے بغیر مجادلہ و موعظت اور حکمت کا وہ اچھا ڈھنگ جو قرآن کو مطلوب ہے یعنی مجادلہ کا بالتی ھی احسن ہونا، موعظت کا حسنہ ہونا اور حکمت کا فی نفسہٖ حسن ہونا وجود پذیر ہی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ قابلیت کے مناسب طبقات کا انتخاب

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح انسانی طبقات کے مراتب اور درجات بے انتہا ہیں اسی طرح علم کے مراتب بھی بے شمار ہیں پس جسے جس درجہ کا علم و خلق حاصل ہو اس پر اسی درجہ کی تبلیغ ضروری ہے اور وہ اپنی ہی قابلیت کے مناسب انسانی طبقات منتخب کر سکتا ہے جو اس کی قابلیت سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص اپنی اعلیٰ حکمت سے فلسفیوں کو تبلیغ کر سکتا ہے اور دوسرا اپنی ادنیٰ حکمت سے معمولی پڑھے لکھوں کو سمجھا سکتا ہے اور تیسرا اپنی کمتر حکمت سے ان پڑھوں کو ہی راہ راست پر لا سکتا ہے تو ان میں سے ہر ایک پر اپنے مناسب طبقہ کو تبلیغ کرنا فرض ہو گا یا مثلاً بعض لوگ فقط جزئیات مسائل کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ بعض لوگ ان کو فقہی رنگ میں سمجھا سکتے ہیں اور بعض ان کی تفہیم فلسفیانہ انداز سے بھی کر سکتے ہیں تو جس کو بھی اپنے رنگ کا طبقہ مل جائے اسے تبلیغ سے روگردانی جائز نہ ہوگی۔

یہی صورت موعظت اور مناظرہ کی بھی ہے ان پڑھوں کے لئے معمولی استعداد کے لوگوں کا وعظ اور مجادلہ مؤثر ہو جاتا ہے اور فلسفی مزاجوں کے لئے اونچی استعداد کے افراد ہی کی موعظت اور مجادلت کارگر ہوتی ہے اس لئے جب بھی جس مبلغ کے حسب حال جماعت اس کے سامنے آ جائے اسے حکمت و موعظت اور مجادلت سے غافل رہنا جائز نہ ہو گا۔ بہرحال کسی صورت میں بھی تبلیغ سے کنارہ کشی ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہو سکتی کہ ہر مسلم جو ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ایمان کے مطابق علم و معرفت بھی رکھتا ہے اور اسی کے اندازہ سے تبلیغ کا مکلف بھی ہے۔

۵۔ سیرت و کردار

پھر مبلغ کے لئے جیسے علم و بصیرت، فہم و فراست اور دانش و خلق ضروری ہے ایسے ہی عمل صالح اور تقویٰ و طہارت کی بھی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر تبلیغ کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہو سکتا۔ دلائل و براہین اور پُرجوش تقریریں وہ اثر نہیں دکھلا سکتیں جو ایک مبلغ کی ذاتی سیرت اور عملی زندگی اس کے سادہ کلام میں اثر پیدا کر دیتی ہے۔ نیک عمل مبلغ حقیقتاً خدا کی حجت اور اس کی آیات میں سے ایک آیت ہوتا ہے جسے دیکھ کر خود بخود دلائل سامنے آجاتے ہیں اور ہزارہا کج قلوب کا معالجہ خود اس کی ذات اور عملی زندگی بن جاتی ہے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اہل دل کا قد و قامت، زاہدانہ لباس، نورانی چہرہ، متانت زندگی اور عاشقانہ ہیئت تو خود ایک مستقل حجت و فلسفہ ہوتی ہے جو دلوں کو سکون و طمانیت بخشتی ہے۔ حضرات صحابہ ورود ہند کے وقت جب سندھ میں پہنچے اور سندھ کے بازاروں سے ان کا گزر ہوا تو ہزارہا انسان محض ان کے چہرے مہرے دیکھ کر ایمان لے آئے اور ان کے دلوں نے شہادت دی کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے۔

گویا کفار و مشرکین کے دلوں سے کفر کا زنگ اور شکوک و شبہات کی آلودگیاں... بغیر کسی سوال و جواب کے محض ان مقدسین کی عملی زندگی نے دھو ڈالیں۔ اسی لئے قرآن حکیم نے امر بالمعروف کے وقت خطباء کو پُرزور ہدایت فرمائی ہے کہ وہ جو کچھ دوسروں کو بتلائیں پہلے خود بھی اس پر عمل کریں۔ اور جو کہیں وہ کر کے بھی دکھائیں۔ ارشاد حق ہے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ؕ

کیا تم لوگوں کو نیکی کا امر کرتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو درآنحالیکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بڑی ہے کہ تم وہ کہو جسے تم خود نہ کرو۔

۴۔ دعوت کی عملی ترتیب

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تبلیغ میں ایک خاص ترتیب قائم فرمائی ہے جس کی ابتدا خود مبلغ کی ذات سے کی ہے یعنی مبلغ پہلے اپنے نفس کو تبلیغ کرکے اُسے نمونۂ عمل بناکر دکھائے اور اس کے بعد بھی فوراً ہی قوم کو مخاطب نہ بنائے بلکہ اس سے پہلے اپنے اہل و عیال کو تبلیغ کرکے انہیں عمل کا نمونہ بنائے اور پھر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اپنے مقاصد سمجھا کر نمونۂ عمل بنائے پھر اپنے شہر اور اس کے مضافات میں عمل کے نمونے قائم کرے تب کہیں بیرونی دنیا تک تبلیغ کا درجہ آتا ہے۔

چنانچہ قرآن نے اسی ترتیب کو قائم کرنے کے لیے (خود مبلغ کے نفس اور پھر اس کے اہل خانہ کے بارے میں فرمایا:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا۔

اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ۔

اور پھر رشتہ داروں کے بارے میں فرمایا۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ۔

اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈرا دیجئے۔

پھر اہل شہر اور مضافات اور اس کے بعد عام اہل ملک کے لئے فرمایا:۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔

تاکہ اہل شہر کو اور جو ان کے قرب و جوار میں رہتے ہیں ان کو ڈرائیں اور آپ ان لوگوں کو اس جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں جس میں کوئی شک نہیں۔

اور سب سے آخر میں عام دنیا کے لیے فرمایا۔

لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔

تاکہ آپ تمام اہل عالم کے لئے نذیر ہوں۔

اس ترتیب سے صاف واضح ہے کہ تبلیغ کا آغاز اپنے نفس سے کرکے پھر علی الترتیب اس کے دائرہ کو وسیع کیا جانا ہی تبلیغ کو مؤثر اور ہمہ گیر کر سکتا ہے۔ بہر حال تبلیغ کا دلوں میں اثر انداز ہونا مبلغ کی ذاتی صلاحیت و عمل پر موقوف ہے کہ بسا اوقات صلاح و عمل کی یہ خاموش زبان ہی تبلیغ کا کام کر جاتی ہے اور بلا کسی تقریر و موعظت کے قلوب فتح ہو جاتے ہیں جو تبلیغ کا اصل مقصد ہے اگر کہا جائے کہ تبلیغ کے لئے سبیل رب کا علماً موجود ہونا کافی ہے اس پر خود عامل ہونے کی بھی ایسی کیا ضرورت ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ حقیقی علم بلا عمل کے باقی ہی نہیں رہ سکتا۔

اوّلاً اس کی بصیرت اور نورانیت مٹتی ہے اور پھر وہ خود ختم ہو جاتا ہے کہ علم کا تحفظ و بقا صرف عمل ہی سے ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:۔

هتف العلم بالعمل فان اجاب والا ارتحل (جامع فضل العلم لابن عبد البر)

(علم عمل کو پکارتا ہے اگر اس نے جواب دیا تو خیر! ورنہ پھر علم کوچ کر جاتا ہے۔

۷۔ خشیت الٰہی و عدم خشیت خلائق

مبلغ کے ان ذاتی اوصاف کے سلسلہ میں جن پر تبلیغ کے اثرات موقوف ہیں سب سے بڑا اور اہم وصف مخلوق سے نڈر ہونا اور اللہ سے ڈرنا ہے یعنی حق کے معاملے میں جرأت اور بے باکی ہونا، مرعوبیت اور مداہنت نہ ہونا۔ گویا مبلغ کے لیے ضروری ہے کہ حق اور احکامِ حق کی عظمت کے مقابلہ میں کسی کی عظمت کا خطرہ اس کے قلب میں نہ ہو جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ مخلوق کا تو کوئی خوف تبلیغ حق میں مانع نہ ہو اور خالق کا خوف تبلیغ حق کے لئے داعی ہو۔

انبیاء علیہم السلام جو سرچشمہ تبلیغ ہیں۔ اس وصف خشیتِ الٰہی اور عدمِ خشیت خلائق میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور راسخ القدم ہوتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا۔

جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی اور سے خوف نہیں کرتے اور اللہ ہی کافی ہے۔

غور کریں تو اس آیتِ دعوت سے یہ وصف بھی صاف طور پر نکل رہا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ مخاطب کو کسی چیز کی محض ترغیب دی جائے تو اس کے امتثال پر ترغیب دہندہ کی محض خوشنودی مرتب ہوتی ہے لیکن اگر کسی چیز کا حکم دیا جائے جو لازم اور اٹل ہو تو اس کی تعمیل کی صورت میں حاکم کی پوری ذمہ داری اور قوت محکوم کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ بصورتِ تعمیل حکم کام حاکم کا انجام پاتا ہے نہ کہ محکوم کا۔ محکوم محض ایک واسطہ تعمیل ہوتا ہے پس ترغیب کی صورت میں تو مخاطب کے لئے یہ گنجائش ممکن تھی کہ وہ کسی کے ڈر اور خوف سے اس کام کو نہ کرے کیونکہ کام کی ذمہ داری خود اسی کرنے والے پر آتی ہے لیکن حکم کی صورت میں اس

کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ قوی حاکم کے احکام کی تعمیل میں کسی اپنے جیسے سے ڈر کر پس و پیش کیا جائے۔ کیونکہ حاکم کی پوری حاکمانہ طاقت اور ذمہ داری اس کی پشت پر ہے اس صورت میں اگر ڈر ہو سکتا ہے تو صرف حاکم کا نہ کہ رعایا کا۔ پس تعمیل حکم کی صورت میں صرف حاکم سے ڈرنا اور اس کے سوا رعایا میں سے کسی سے نہ ڈرنا خود حاکم حکم کا مقتضا ہے۔ اس صاف و صریح قاعدہ کو پیشِ نظر رکھ کر اب اگر آیتِ دعوت پر غور کیا جائے تو واضح ہو گا کہ یہاں دعوتِ الی اللہ کی ترغیب نہیں دی جا رہی ہے کہ یہ تبلیغ و دعوت مبلغ کے حق میں اس کا ذاتی کام ٹھہرے اور اس کی اپنی ذمہ داری ہو بلکہ احکم الحاکمین کیطرف سے حکم محکم دیا جا رہا ہے جس سے واضح ہے کہ یہ کارِ دعوت و تبلیغ درحقیقت سرکاری کام ہے مبلغ کا ذاتی کام نہیں اور اس لیے اس کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی خود خدا پر ہے نہ کہ مبلغ پر۔

۸۔ استغناء

داعیٔ دین کے ذاتی اوصاف کے سلسلے میں ایک آخری اور بنیادی وصف استغناء ہے۔ جس کے بغیر تبلیغ کا وقار اور احترام قائم نہیں ہو سکتا۔ لالچی اور خود غرض انسان کبھی میدانِ تبلیغ کا مرد نہیں بن سکتا اور نہ کبھی بے باکانہ تبلیغ کر سکتا ہے گویا خشیت اللہ کے بجائے خشیت الخلق درحقیقت لالچ اور طماعی سے پیدا ہوتا ہے اور مبلغ کے قلب میں جب اپنے مستفیدوں سے طمع پیدا ہو گئی تو یقیناً وہ ان کا محتاج ہو گیا اور محتاج انسان کمزور ہوتا ہے اس لئے اس میں تبلیغ حق کی جرأت پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ مخاطبوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے ؎

آز بگذار و بادشاہی کن

اس لئے مبلغ کا سب سے بڑا جوہر استغناء اور خودداری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

انبیاء علیہم السلام نے تبلیغی مساعی کے سلسلہ میں خوف و خشیتِ الٰہی اور اتباعِ رسالت کے
کا وعظ سنانے سے پیشتر اپنے جس وصف کا کھول کھول کر اعلان کیا وہ سوائے استغناء کے
دوسری چیز نہ تھی چنانچہ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ
علیہم الصلوٰۃ والسلام تبلیغی مواعظ کے سلسلہ میں قرآن نے سب کا ایک ہی قول نقل
کیا ہے۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ

میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ
ہے پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

مبلغ کے اتنے اہم اور بنیادی مقصد سے یہ آیتِ دعوت جو تبلیغ کا ایک جامع
پروگرام ہے اپنے اندر رکھتی ہے کیسے اغماض کر سکتی تھی؟ چنانچہ استغناء کی طرف بھی
اسی آیت میں لطیف اشارہ موجود ہے جو سمجھنے والوں کے لئے کفایت کرتا ہے اور وہ یہ کہ
اس آیتِ دعوت میں دعوتِ الی اللہ کے تمام اصول و مقاصد بیان فرما کر آخر میں اعلان
فرمایا گیا کہ:

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔

بے شبہ تیرا رب خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے گمراہ ہو گیا ہے
اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ مبلغ کا فرض محض تبلیغ کی انجام دہی ہے اسے یہ فکر چھوڑ
دینی چاہیئے کہ کون ہدایت پر آتا ہے اور کون نہیں۔ گویا اسے نتیجۂ تبلیغ کا انتظار ہی نہ ہونا
چاہیئے جس کے یہ معنی ہیں کہ مبلغ کو تبلیغ کے ثمرات سے بھی مستغنی رہنے کی ہدایت
فرمائی گئی ہے۔

پس جس کارِ تبلیغ میں اس درجہ منہمک رہنے کا امر ہے کہ خود اپنے کام

کے نتائج کی فکر بھی چھوڑ دے اور اپنی مساعی کے معنوی ثمرات کا خطرہ بھی دل میں نہ لائے
تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اسی مبلغ کو کارِ تبلیغ کے کسی مادی ثمرہ کی فکر میں غلطاں پیچاں چھوڑ دیا
جاتا کیونکہ تبلیغ کا ثمرۂ ہدایت جو مقاصدِ عالیہ میں داخل اور شرعاً مطلوب تھا جب اس سے
مبلغ کے قلب کو فارغ کر دیا گیا تو کسی غیر مطلوب اور وہ بھی خسیس ثمرہ (یعنی زر و مال)
اور اس کی بھی حریصانہ طلب میں مبلغ کے قلب کو کیسے ملوث چھوڑا جا سکتا تھا؟ بہر حال
آیتِ دعوت سے استغناء کا مطلوب ہونا قیاس بالا ولویت سے ثابت ہو جاتا ہے
جیسے آیت وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ سے کپڑوں کی پاکی کے حکم سے بدن کی پاکی کا حکم بالا
ولویت ثابت کیا جاتا ہے۔

۹۔ صبر و تحمل

ان تمام اوصاف و آداب کے لئے جو تبلیغ کا مقدمہ ہیں مبلغ کے لئے چند ایسے
بنیادی اوصاف کی بھی ضرورت ہے جو دورانِ تبلیغ میں اس کی تبلیغ کو محکم اور مؤثر بنا کر اس
کی ذات میں جاذبیت پیدا کریں اور ظاہر ہے کہ ان اخلاق کا حاصل مخلوق کی اوچھی کڑوی جھیلنا
اور ان کے معاملات میں ایثار سے کام لینا ہے یعنی صبر، حلم، ضبط اور تحمل وغیرہ
جو سلسلۂ تبلیغ کی پختگی اور پائیداری کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہیں وجہ یہ ہے کہ
دورانِ تبلیغ میں عموماً نا عاقبت اندیشوں یا بدنیتوں کی طرف سے تلخیٔ حق کا جواب ایذا رسانی
اور سخت کلامی سے دیا جاتا ہے اگر مبلغ میں صبر و ضبط نہ ہو تو اس کے لئے تبلیغ کا میدان کبھی
ہموار نہیں ہو سکتا۔

کفار کی قولی ایذا رسانیوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تحمل کی ہدایت فرمائی گئی اور
آپؐ نے صبر و ضبط کا عملی نمونہ قائم کر کے دکھا دیا۔

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ

مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

تمہارا امتحان تمہارے مالوں میں اور جانوں میں کیا جائے گا اور تم ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں اور جنہوں نے شرک کیا تھا سخت تکلیف دہ باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور ڈرو تو بے شبہ یہ بہت عزم کے کاموں میں سے ہے۔

چنانچہ قولی ایذا رسائیوں سے آپؐ کو ساحر، مجنون، کذاب (العیاذ باللہ) سب ہی کچھ کہا گیا لیکن آپؐ نے صبر و تحمل سے کام لیکر دعوت و ارشاد کا سلسلہ منقطع نہیں فرمایا۔

پھر اسی طرح عملی ایذا رسانی کی بھی ادھر سے کمی نہیں ہوئی۔ کانٹے آپؐ کے راستے میں بچھائے گئے، زہر آپؐ کو دیا گیا۔ سحر آپؐ پر کرایا گیا، طائف میں پتھر آپؐ کے مارے گئے، کتے آپؐ کے پیچھے لگائے گئے، دندان مبارک آپؐ کا شہید کیا گیا، بائیکاٹ آپؐ کا کرایا گیا۔

لیکن آپؐ کے پایہ صبر و استقلال میں کوئی ادنیٰ جنبش نہیں ہوئی اور فرض تبلیغ کے ادا کرنے میں کوئی ادنیٰ خلل نہیں آیا اور ایسا ہوتا بھی کیونکر؟ جبکہ قرآن کا یہ حکم آپؐ ہی کے لئے تھا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا

آپؐ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کیجئے اور ان کے لئے جلد بازی نہ کیجئے۔ پس آپؐ صبر جمیل کیجئے۔

۱۰۔ عفو و درگزر

پھر اس راستے میں ایک صبر ہی درکار نہیں کہ مبلغ ان ایذا رسانیوں کا تحمل کر کے چپکا ہو رہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ان شرارتوں کو معاف بھی کر دینا چاہیئے کہ اسی لئے مخاطب انجام کار ہموار ہو جائیں گے اور انہیں کے آثار سے اس کی شفقت پہچانی جائے گی۔

اسی لئے حضورؐ کو حکم دیا گیا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔

آپؐ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ۔

آپؐ ان سے اچھے طریقے سے درگزر فرمائیے۔

پھر نہ صرف معاف کر دینے پر قناعت کا حکم ہوا بلکہ مبلغ کی خوبی یہ ہے کہ ان برائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی کرے اور احسان و حسن سلوک سے پیش آئے۔ جیسا کہ احادیث میں ان اخلاق کو اعلیٰ کیرکٹر کے سلسلے میں شمار کرتے ہوئے الوالعزمی کا نشان بتلایا گیا ہے۔

ارشاد نبویؐ ہے۔

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ۔

جو لوگ تم سے بدمعاملگی کریں تم ان کے ساتھ بھی صلہ رحمی کا برتاؤ کرو۔ اپنے ظالموں کو معاف کر دو اور جو تم سے برا سلوک کریں تم ان سے اچھا سلوک کرو۔

بہر حال مخاطبوں کی گستاخیوں کو جھیلنا بلکہ انہیں معاف کر دینا بلکہ اور الٹا ان پر احسان کرنا مبلغ کے خاص تبلیغی اخلاق ہونے چاہئیں کہ ان کے بغیر تبلیغ میں پائیداری اور تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان خاص اوصاف کو چونکہ مبلغ کے ذاتی کیرکٹر اور منصب تبلیغ میں خاص دخل تھا اس لئے قرآن مجید نے صریح عبارت میں بھی ان اوصاف کی طرف خصوصی توجہ دلائی، فرمایا:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔

اور اگر تم سزا دو تو اتنی دو جتنی تم کو دی گئی ہے لیکن اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔

وَاصبروما صبرك الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تك فی ضیق مما یمکرون ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون

اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا صرف اللہ کی وجہ سے ہوگا اور ان لوگوں کا نہ غم کیجئے اور نہ تنگ دل ہو جیئے ان کے مکروں کی وجہ سے بے شبہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ کرتے ہیں اور وہ لوگ جو محسن ہیں۔

پس اس آیت کے اس آخری حصہ نے مبلغ کے ان اخلاق کے تمام اصولی مدارج واضح فرما دیئے جن کا تعلق مخاطبوں کی تربیت وتعلیم سے فعلاً قائم ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مبلغ میں جذبۂ انتقام، جوش وغضب، شدت وغلظت، حملہ آوری، نبرد آزمائی مقابلہ و معارضہ اور ٹکرا جانے سے بہتر یہی ہے کہ وہ مخاطبوں کی نالائقیوں کے باوجود اپنے حزن و ملال کو پی کر ضیق اور کڑہن سے ہٹ کر اور ان کے مکروفریب سے قطع نظر کرکے صبر وتحمل عفو ودرگزر۔ تقویٰ وطہارت اور احسان وسلوک کو اختیار کرے اور اس کا خیال رکھے کہ ان اوصافِ حمیدہ کے ہوتے ہوئے خدا اس کے ساتھ ہے۔

داعی کے اضافی اوصاف

یہاں تک آیت سے ان اوصاف کے اثبات کی تقریریں کی گئی ہیں جو مبلغ کی ذاتی اصلاح سے متعلق تھے۔ گو فعل تبلیغ کی تاثیر اور پائیداری ان پر موقوف تھی کیونکہ ان کے بغیر مبلغ کا ذاتی کیریکٹر قائم نہ ہوتا تھا کہ وہ مسندِ تبلیغ پر آسکے۔ اب یہاں سے ان اوصاف وآداب پر غور کیجئے جن کا اولین تعلق فعل تبلیغ سے ہے۔

گو وہ بھی مبلغ ہی کے اوصاف ہیں مگر عملی طور پر ان کا ہر ایک عملی سرا مدعو اور مخاطب سے بھی جا ملتا ہے گویا پہلے اوصاف مبلغ کے ذاتی تھے اور یہ اضافی ہیں، یا پہلے صلاحی

تھے اور یہ اِصلاحی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ سابقہ اوصاف کا تعلق مبلغ کے ذاتی اصلاح ورشد سے تھا اور ان ذیل کے اوصاف کا تعلق اس کی تعلیم وہدایت سے ہے

پس مبلغ کا پہلا اضافی وصف تعلیم وارشاد کے ساتھ شانِ تربیت ہونا چاہیئے جس کے ماتحت وہ اپنے مخاطبوں میں آہستہ آہستہ تدریجی رفتار سے ایک خاص رنگ پیدا کرکے انہیں حدِ کمال پر پہنچائے۔

ا۔ شانِ تربیت

تربیت کے معنی کسی چیز کو رفتہ رفتہ اس کی حدِ کمال پر پہنچانے کے ہیں جیسے درخت کو ایک کونپل سے بتدریج تناور درخت بنا دینا یا انسان کو آہستہ آہستہ پال پوس کر بچہ سے ایک بڑا انسان کر دینا تربیت اور ربوبیت کہلائے گا۔ پس جس طرح ماں باپ ایک بچہ کے جسم کو اسبابِ حسیہ یعنی غذا کے ذریعے بتدریج شباب کے کمال تک پہنچا دیتے ہیں اور اس پہنچے ہوئے کو بالغ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح ایک مبلغ وداعی اور معلم خیر انسان کی روح اور روحانی قوتوں کو اسبابِ معنویہ یعنی علم وکمال کے ذریعے بتدریج روحانی کمال تک پہنچانے میں اپنی ہمت صرف کرتا ہے اور جسے وہ پہنچا دے گا اسے واصل کہیں گے۔ پس اس شانِ تربیت کے ماتحت مبلغ کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے مخاطبوں کو ان کی ذہنی ارتقاء کی حد تک علمِ الٰہی سے نشو ونما دیتا رہے اور جتنی جتنی ان کی ذہنیتیں مستعد ہوتی رہیں وہ اسی کے مطابق اپنی تعلیم کو بھی اونچا کرتا رہے۔

اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیم وتربیت کی لائن پر اوّل چھوٹے چھوٹے اور آسان مسائل سے تربیت شروع کرے جنہیں ان کا ابتدائی ذوق قبول کر سکے اور بعد میں مہمات مسائل اور اصول وکلیات پر لائے۔ اگر وہ اس وطیرۂ طبعی پر چلے گا تو شرعی زبان میں اس کا لقب ربّانی ہوگا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ربّانی کی تفسیر یہی کی ہے کہ وہ اپنے

مستفیدوں کو بتدریج چھوٹے مسائل پر لگا کر بڑے مسائل تک لائے نہ یہ کہ ابتداءً ہی اونچے اونچے مضامین بیان کر کے گویا مخاطبوں بلا زینہ بام رفیع پر پہنچانے کی سعی کرے۔ ابن عباس ربانی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

الذی یربی الناس بصغار العلم ثم بکبارها۔ (بخاری)

جو لوگوں کی تربیت پہلے چھوٹے علم سے اور پھر بڑے علم سے کرے۔

آیتِ دعوت میں مبلغوں کی اس شانِ تربیت کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں اسلام کو سبیلِ رب سے تعبیر فرما کر اس سبیل کو اللہ کی صفت ربوبیت کی طرف منسوب فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تدریجاً کمال تک پہنچانے والے کے راستہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور یہ اصول مسلمہ اہلِ عقل اور اہلِ بلاغت ہے کہ اس قسم کے مواقع پر ایسی اضافتوں میں مرکب اضافی کے آخر کلمہ کا وصف اول کلمہ میں باور کرانا ملحوظ خاطر ہوتا ہے مثلاً کسی غضبناک کو جو غیض وغضب میں بھڑک رہا ہو یوں تنبیہ کی جائے کہ اسے بندۂ رحمن کیا کر رہا ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رحمت والے کا بندہ ہو کر یہ غیظ وغضب! تجھے تو رحمت کا پیکر ہونا چاہیئے تھا۔ یا کسی شخص کو جہالت کی حرکات کرتے ہوئے دیکھ کر کہا جائے کہ اسے عالم کے بیٹے کیا کر رہا ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تجھے تو علم سے نسبت تھی پھر یہ جہالت کیسی؟ اگر نسبت واضافت سے یہ فائدہ حاصل نہ ہو تو یہ مرکب اضافی محض لغو اور فضول ہو جائے۔ جس سے بلغا کا کلام بری ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح جب مبلغوں اور داعیانِ دین کو خطاب کیا گیا کہ ربوبیت والے کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس راہ میں ربوبیت کی شان پیدا کرو یعنی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ ان کے قلوب وارواح کو حدِ کمال تک پہنچاؤ۔

ظاہر ہے کہ اگر سبیل کی اضافت ربّ کی طرف ہونے کے باوجود ابلاغ سبیل میں یہ وصف تربیت ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ اضافۃ محض لغو اور بے فائدہ ہو جائے گی۔

حالانکہ ایسی لغویت سے تو معمولی متکلموں کا کلام بھی پاک ہوتا ہے چہ جائیکہ رب العالمین کا کلام اعجاز التیام! بس داعی دین کے لئے محض پیام رسانی کافی نہیں ہو سکتی بلکہ اسے اپنے مخاطبوں کے حق میں مربی اور مشفق ہونا چاہیئے جس سے بتدریج وہ روحانی نشوونما پائیں اور ایک خاص رنگ سے رنگے جائیں۔

پھر تربیت کے معنی ہی چونکہ کسی چیز کو آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کمال پر پہنچانے کے ہیں اس لئے تربیت کے ماتحت سب سے پہلا مقام تدریج وتیسیر ہے کہ طالبانِ حق کو رفتہ رفتہ مطلوبہ نقطہ تک پہنچایا جائے جس میں مخاطبوں کی سہولت اور ان کی رفتارِ قبولیت کی رعایت بھی پیشِ نظر ہو۔

۲۔ دعوتی پروگرام کا تجزیہ

اس میں سب سے پہلی چیز پروگرام کا تجزیہ ہے یعنی مکمل پروگرام کے حصّے اور اجزاء الگ الگ کر کے تبلیغ میں وہ اجزاء مقدم کئے جائیں جن کا ماننا مخاطب پر زیادہ شاق نہ ہو اور وہ کسی حد تک اس حصّے سے مانوس ہو کیونکہ اگر سارے احکام کی نامانوس اور بوجھل گٹھڑی ایک دم اس پر لاد دی جائے تو وہ پہلے ہی مرحلہ میں اس سے وحشت زدہ ہو کر پورا بوجھ اپنے سر سے ایک دم اتار پھینکے گا اور تبلیغ رائیگاں چلی جائے گی۔

مثلاً حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو جب یمن کا گورنر اور قاضی بنا کر بھیجا تو تبلیغی سلسلہ میں اسی مرحلہ وار پروگرام اور ترتیب طبعی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں وہاں نصاریٰ کی قوم ملے گی۔ انہیں دین کی دعوت اس طرح دینا کہ اوّل ان کے سامنے کلمہ توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پیش کرنا۔ جب وہ اسے قبول کر لیں تو پھر کہنا کہ نماز کا بھی ایک فریضہ تم پر عائد ہوتا ہے۔ جب وہ اسے بھی مان لیں تو کہنا کہ تمہارے مالوں میں تم پر زکوٰۃ کا بھی ایک فریضہ آتا ہے۔ جب وہ اسے بھی تسلیم کر لیں تو روزہ کی تلقین کرنا۔

و علیٰ ہٰذا القیاس ۔ مرحلہ وار پروگرام کا یہ مربیانہ سلوک اس لئے اختیار کیا گیا کہ غیر مانوس طبیعتیں نہ ابتداءً ہی غیر مذہب کے سارے پروگرام سے مانوس ہو سکتی ہیں اور نہ اعتقاداً اور عملاً اس کا تحمل کر سکتی ہیں بلکہ بتدریج ہی ان میں استعدادِ قبول پیدا ہو سکتی ہے۔

اگر ان کی ابتدائی ناقص استعداد اور نامکمل انسیت کی حالت میں انتہائی احکام تک کا مکمل بوجھ ان پر ڈال دیا جائے تو وہ اچٹ کر سرے سے سارے ہی پروگرام سے بیزار ہو جائیں گے اور اس طرح ہدایت سے ہمیشہ کے لئے محروم رہیں گے۔

قرآن کریم نے اہلِ کتاب کو تبلیغی خطاب کرتے ہوئے اسی تدریج و تیسیر کی تائید کی اور اسلامی پروگرام میں اعتقادات اور ان میں سے بھی توحید عبادت کو یہ کہہ کر مقدم رکھا ہے کہ اس اعتقاد پر آجانا اہلِ کتاب پر بھاری نہیں ہے جبکہ وہ پہلے سے بھی اس دعوئے توحید سے گریز کئے ہوئے نہیں ہیں۔ فرمایا۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ

آپ فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب تم اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے اور وہ یہ کہ ہم سوائے خدا کے کسی اور کی عبادت نہ کریں گے اور نہ کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک کریں گے اور نہ خدا کے سوا ہم میں سے کوئی کسی کو رب بنائے گا۔

بہر حال شانِ تربیت کے تقاضے کے ماتحت تجزیہ پروگرام ایک امرِ طبعی ہے جس کے بغیر تبلیغ کارگر نہیں ہو سکتی۔

۳۔ احکامِ الٰہی کی مرحلہ وار تعمیل

اسی شانِ تربیت کے ماتحت محض پروگرام کے مرحلہ وار عملدرآمد ہی کی نہیں بلکہ گاہ بگاہ تجزیہ مسائل کی بھی نوبت آجاتی ہے یعنی ایک ہی مسئلہ کی تحلیل کر کے اس کے چند حصے کر لئے

جائیں اور ایک ایک حصے کی تبلیغ حسبِ استعدادِ مخاطب بتدریج کی جائے۔

چنانچہ حق تعالیٰ نے اہلِ عرب کو جب شراب سے روکنا چاہا جو ان کی گھٹی میں پڑی تھی تو ایک دم شراب کو حرام نہیں کیا بلکہ پہلے حکم شراب کی کچھ برائی بیان فرمائی گئی اور وہ بھی لوگوں کے سوال کرنے پر جب اس سے لوگوں میں شراب سے بچنے کی فی الجملہ استعداد پیدا ہو چلی تو ایک قدم آگے بڑھ کر نماز کے اوقات میں شراب سے روکا گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ۔

اے ایمان والو! تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم اسے جانو جیسے تم کہو۔

اور جب یہ دوسرے حکم سے عملاً شراب سے رکنے پر قادر ہونے لگے تو پھر دوسرا قدم اور آگے بڑھا کر صفائی سے شراب کی حرمت اور نجاستِ عین ہونے کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا کہ:

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ۔

ناپاک ہے اور شیطان کا عمل ہے تم اس سے بچو۔

اس کے بعد دلوں میں سے شراب کی محبت جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع فرما دیا گیا جو شراب کے لئے جام و سبو کا حکم رکھتے تھے یعنی حنتم (کوزہ سبز) دبار (خشک کدو) نقیر (کادیدہ چوب جام) مزفت (روغنی پیالہ وغیرہ)

اس سے واضح ہے کہ اگر کوئی برائی قدیم سے کسی قوم میں رچی ہوئی ہو تو اس کے استحصال کی صورت ہی یہ ہے کہ اس ایک برائی کے چند اہم اجزاء الگ الگ نکال کر تدریجی ممانعت کی جائے کہ ایسی صورتوں میں تدریج و تیسیر ہی ایک فطری روش ہے جو مخاطب کو آہستہ آہستہ مسئلہ کی آخری حد تک کھینچ کر لا سکتی ہے۔ نماز کی وہ مہذب صورت جو نکھر کر آج امت کے زیرِ عمل ہے کتنی تدریجی رفتار سے یہاں تک پہنچی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ

ابتداءً نماز میں سلام و کلام، بات چیت، دیکھنا اور سننا، گردن پھیرنا، منہ موڑنا، چلنا پھرنا سب ہی کچھ جائز تھا اور اس کی موجودہ مکمل صورت قائم نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ لوگوں میں ابتداءً اتنی مکمل شائستگی اور موزونیت ہی نہ تھی۔

اس لئے نماز کی ہیئت میں آہستہ آہستہ یہ تمام تہذیبیں قائم کی گئیں کسی وقت دیکھنا اور منہ اِدھر اُدھر کرنا ممنوع ہوا۔ کسی وقت سلام و کلام کی ممانعت آگئی۔ کسی وقت چلنے پھرنے کی ممانعت ہوئی۔ کسی وقت وقت خشوع و خضوع ضروری ٹھہرایا گیا۔ گویا اس کے حصے حصے کر کے بتدریج اس میں شائستگی پیدا کی گئی جس کا حاصل وہی تربیت نکل آیا۔

۴۔ مستقل مزاجی

اور جبکہ شانِ تربیت کے ماتحت کسی کام کو آہستہ آہستہ چلانے اور بتدریج آگے بڑھانے میں کافی انتظار کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ بالخصوص جبکہ راہِ تربیت میں لوگوں کو ان کے خلافِ طبع آمادہ کرنے کے سبب قدم قدم پر مخاطبوں کی طرف سے مخالفت اور ایذا رسانی کے واقعات پیش آتے ہوں اور ایسی حالت میں انسانی کمزوریوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ہمت ہار کر میدان چھوڑ بھاگے تو ایسے ہی اوقات میں تمکن پختگی اور استقلال سے ان کمزوریوں کا تدارک ہو سکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ایسے تدریجی امور میں جلد بازی، عجلت پسندی اور تلون سمِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔

یہاں اگر کوئی چیز نتیجہ خیز ہو سکتی ہے تو وہ صرف تمکن و استقلال اور دوام و ثبات ہے کہ اس کے بغیر تربیت اور نتائجِ تربیت کا ظہور عادۃً ناممکن ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عکاظ و مجنہ کے بازاروں کے مواقع پر تبلیغ کے لئے تشریف لے جاتے یا حج کے مواقع پر لوگوں کو پیغامِ الٰہی پہنچاتے اور کفارِ مکہ آپ کی راہ میں روڑہ بن کر اٹھتے اور توہین کی سعی کرتے تو آپ کے پائے استقلال میں ان کی

رکاوٹوں سے ادنیٰ خلل نہ آتا کہ یہی شانِ تربیت کی اساس ہے۔

۵۔ صحبت و معیت

تربیت کے لئے عجلت پسندی یا تلون سمِ قاتل ثابت ہوتا ہے تمکن و استقلال ضروری ہے جس کے لئے لامحالہ طویل وقفہ اور وقت کی ضرورت ہے اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مبلغ مخاطبوں کو اپنے ساتھ زمانہ طویل تک وابستہ رکھے تاکہ ان میں تبلیغ و تربیت سے کوئی خاص رنگ قائم ہو جائے جسے شرعی اصطلاح میں صحبت و معیت کہتے ہیں چنانچہ دینی رنگ کی اساس یہی صحبت و معیت ہے جس کے ذریعے انبیاء علیہم السلام اپنے وابستوں کو تربیت دے کر حدِ کمال تک پہنچاتے ہیں اور اسی لئے ان کے بلاواسطہ مستفیدوں کو صحابہ یا اصحاب یا حواری کہا گیا ہے جن کا مادہ یہی صحبت ہے اور جن میں بواسطہ صحبت آثارِ نبوت سب سے زیادہ راسخ ہوتے ہیں۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ جو اصحاب آپ کے زیرِ تربیت ہیں اور بالخصوص فقراء مسلمین آپؐ ان کو صبح و شام اپنی صحبت میں رکھیے۔

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوٰة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان امره فرطا.

اور آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھیے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کا ارادہ کرتے ہیں اور آپ اپنی آنکھیں ان سے نہ ہٹائیے اس حال میں آپ دنیوی زندگی کی زینت کے خواہاں ہوں اور آپ ان لوگوں کی اطاعت نہ کیجیے جن کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کا اتباع کرتے ہیں اور جن کا معاملہ زیادتی کا ہے۔

بہرحال داعی الی اللہ کے سلسلے میں ۲۷ مقامات ثابت ہوئے جن میں سے بعض مبلغ کی ذات کے لیے ضروری ہیں۔ اور بعض اس کے فعل تبلیغ کے لیے یعنی علم وبصیرت، فہم وفراست عقل سلیم، ضبطِ نفس، ذاتی کیریکٹر، خشیت اللہ، عدم خشیۃ غیر اللہ، استغناء، صبر وتحمل عفو ودرگذر، شانِ تربیت وتزکیہ، تدریج وتیسیر، تجزیہ پروگرام، تجزیہ مسائل، تمکن واستقلال عدم استعجال اور صحبت ومعیت جن کے بغیر ایک مبلغ کی تبلیغ کبھی تام اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

یہ تمام عرض کردہ مباحث جو تبلیغ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کتاب وسنت کے مختلف مواقع پر صریح عبارات میں منصوص طریقہ پر موجود ہیں لیکن چونکہ میرے فکر نارسا کے مطابق یہ جامع آیت ان سب کو کسی نہ کسی طرح اپنے نظم میں محیط تھی اس لئے اسی آیت کو اس رسالہ کا سر نامہ بنا کر ان مقاصد کا اس سے استنباط پیش کیا گیا۔

اگر ان اصولوں پر صحیح معنوں میں منظم تبلیغ شروع ہو جائے تو مسلمانوں کے تمام دینی و دنیوی اور مذہبی وسیاسی مقاصد بے تکلف حاصل ہو سکتے ہیں جن کیلئے مختلف پلیٹ فارموں سے جد وجہد بہت کچھ جاری ہے مگر نتائج سے ہمکناری میسّر نہیں آرہی ہے۔

قرنِ اوّل کے فاتحانہ اقدامات میں دعوتِ اسلامی کا کردار

قرنِ اوّل کی مقدس جماعتیں جس ملک میں بھی فاتحانہ انداز کے ساتھ پہنچیں انہوں نے تبلیغِ اسلام کے فریضہ کو ہمیشہ مقدم رکھا اور ملک میں دین کو برپا کرنے کو اولین اہمیت دی اس لئے کہ ان کے نزدیک فتوحاتِ ممالک کا منتہائے مقصود اشاعت اسلام اور تعلیم وتبلیغِ دین ہی تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ جس ملک کو بھی فتح کرتے اس میں تبلیغِ حق کی بدولت اسلامی نظام کے لئے فضا خود بخود ہموار ہوتی چلی جاتی تھی اور اسلامی دولت کے ساتھ اسلامی نظم بھی عام رعایا میں طبعی طور پر خود ہی قائم ہو جاتا تھا اور اس طرح یہ حضرات ممالک واقالیم ہی کے نہیں دلوں اور روحوں حتیٰ کہ عام تہذیبوں اور کلچروں کے بھی فاتح ہو جاتے تھے۔

یہ ناممکن تھا کہ دنیا کی زمینوں میں تو کاشت ان کی ہو اور خود ان کے دلوں کی زمینوں میں تخم ریزی وہاں کے رسم ورواج کی ہوتی رہے اور وہ نہ بدلیں بلکہ وہ اس تبلیغ اور پھر عملی تبلیغ کی بدولت اسلامی اصول کی تخم ریزی بھی عامۂ قلوب میں کر کے وہاں کی زمین اور آسمان کو بدل ڈالتے تھے اس فتح عام کا یہ ثمرہ نکلتا تھا کہ مفتوحہ ممالک کا نظامِ سیاسی بھی خود بخود اسلامی سانچوں میں ڈھلتا چلا جاتا تھا اور وہ سلطنت محض مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی ہو جاتی تھی۔

یعنی سلطنت کے بجائے خلافت کی جڑیں مضبوط ہو جاتی تھیں، قانونِ الٰہی کی عظمت وسطوت، عام رعایا کے قلوب پر حکمران ہو جاتی تھی۔ بندوں کی بندوں پر نہیں بلکہ بندوں پر خدا کی حکومت کا نقش جم جاتا تھا جس سے کوئی بندہ اپنے کو بندہ جانتے ہوئے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے تمام مفتوحہ علاقے خلافت سے وابستہ ہو جاتے تھے اور ان خلفاء الٰہی کا دم بھرنے لگتے تھے۔

اخلاقِ فاضلہ کا دور دورہ ہو جاتا تھا۔ دلوں میں قومی یا وطنی عصبیت کے بجائے ہمہ گیر اخوت اور خلوصِ باہمی کے جذبات ابھر آتے تھے جن کے ثمرات امنِ عام اور سکون تام کی صورت میں نمایاں ہوتے تھے خود غرضیوں اور عیّاریوں کے لئے جگہ نہیں رہتی تھی۔ بددیانتی اور کم حوصلگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگتا تھا، صلح اور جنگ ملنا اور قطع ہونا سب اصولِ فطرت کے مطابق ہو جاتا تھا۔

غرض اسلامی اخلاق واعمال کے ہمہ گیر بن جانے کے لئے اس تبلیغ کی بدولت فضا ہموار ہو جاتی تھی اور دلوں میں اسلامیت کی تخم ریزی سے فتنے خود بخود سست پڑ جاتے ہیں۔

قیام حکومتِ الٰہیہ سے پہلے

دعوت وتبلیغ کی ضرورت

میری غرض یہ ہے کہ اسلامی قانون اور شرعی سیاست اپنی ذات سے معقول دلپذیر امن بخش اور مظالم شکن سہی لیکن اس کے لئے اسی کے مناسب فضا اور ماحول کی بھی تو ضرورت ہے جو اسے دلچسپ اور دلپذیر بنائے اور وہ ماحول بغیر اس حقانی تبلیغ اور دعوت وارشاد کے پیدا نہیں ہو سکتا جو عرض کردہ قرآنی اصول پر مبنی ہو۔ اس لئے اس نظامِ تبلیغ کو چھوڑ کر اسلامی دیانت وسیاست دونوں کے لئے زمین ہموار کر لینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

اگر بغیر اس کے یعنی ارشادی نظام کے اسلامی حکومت کا کوئی ڈھانچہ قائم بھی کر لیا جائے تو محض برائے نام اور رسمی جس میں نہ کوئی جذب وکشش ہوگی نہ پائیداری اور پختگی اور اگر کسی حد تک ہوئی بھی تو پھر اس سے لادینی کی فضا ہموار ہوتی رہے گی جو انجامِ کار خود اسلامی مقاصد کے لئے مخرب ثابت ہوگی اس لئے دیانت ہی کے حق میں نہیں سیاستِ اسلامی کے حق میں بھی یہ تبلیغ وارشاد ایک روحِ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج امت کا سب سے شدید مرض اور عظیم فتنہ یہی ترکِ تبلیغ اور ترکِ امر بالمعروف ہے جس نے اس کے ہر ایک نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ جب کسی خاطی اور مجرم کو اپنے جرم وخطا پر مطلع ہونے کی صورت ہی نہ رہے اور کسی کی طرف سے کسی کی روک ٹوک کرنے کا راستہ ہی کھلا ہوا نہ ہو گویا مریض کو خود اپنے مرض کی خبر ہو نہ دوسرے کی طرف سے تنبیہ کی صورت ہو تو ظاہر ہے پھر ازالۂ مرض کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے اور قوم کس طرح پنپ سکتی ہے؟

مسلم ممالک میں دعوت وتبلیغ کا فقدان

افسوس ہے کہ آج نہ امت کے عوام ہی اس پر کاربند ہیں نہ خواص اور نہ بااقتدار ہی۔ آج کسی تاریخی حوالہ سے یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ زمانہ حال کی ترکی، ایران، افغانستان، حجاز مصر، عراق وغیرہ کی حکومتیں اسلام کے پھیلانے، اسلامی تعلیمات کو رائج کرنے اور شعائر اسلام کو زندہ کرنے میں اپنی طاقتوں کا کل حصہ نہیں کم از کم اس کا عشر عشیر ہی صرف کر رہی ہوں جتنا ان ممالک کی تمدنی ضروریات کے نام پر یورپین ممالک کی نقل اتارنے میں صرف کر رہی ہیں نہیں بلکہ میری معلومات کی حد تک آج کی مسلم ریاستوں کا نظام نہ صرف یہی کہ ترویج اسلام میں مددگار نہیں بلکہ اس کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ اور تبلیغ حق کے لئے ایک محکم سنگِ راہ ثابت ہو رہا ہے اور انتہا یہ ہے کہ اس طرزِ عمل کو اعلانوں اور دعاوی کے ذریعہ فخریہ طور پر شائع بھی کیا جا رہا ہے جو اس رکاوٹ اور تخریب مذہب پر گویا باضابطہ مہر کر دینا ہے۔

مسلم ممالک کی بیجا رواداری

مثلاً کسی مسلم ریاست کا یہ اعلان کہ "سلطنت کا بحیثیت حکومت کوئی مذہب نہیں" یا "بادشاہ کا بحیثیت حکمران ہونے کے اسلام مذہب نہیں ہے" اسلام کی جڑوں کے لئے پانی ثابت ہو سکتا ہے یا تیشہ؟ اور کیا ایسے اعلانات کے ہوتے ہوئے کسی مسلم سلطنت سے ترویج اسلام کی توقع بجا طور پر باندھی جا سکتی ہے؟

ان حالات میں اگر توقع ہو سکتی ہے تو لامذہبی اور لادینی کی اشاعت کی نہ کہ اسلام کی ترویج اور دین کی تبلیغ کی۔ کیونکہ ان اعلانات کے مطابق جب سلطنت کا کوئی مذہب ہی نہ ہو گویا لامذہبی اس کا مذہب ہو تو اس لامذہبی کے مذہب ہی کو اس سے فروغ بھی ہو سکتا ہے جس کا آج کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

اس قسم کے اعلانات کی بڑی وجہ غیر مسلم رعایا سے رواداری اور اپنی بے تعصبی بتلائی جاتی ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ حقیقتاً غیر مسلموں کی دل شکنی کی خاطر اسلام کی تبلیغ ترک کی گئی تھی تو کم از کم مسلمان رعایا کی خاطر غیر اسلامی تہذیب و کلچر، غیر اسلامی تعلیم و تربیت اور غیر اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت بھی ترک کرنی چاہیئے تھی جو براہ راست اسلام کے حق میں ضرب کاری اور تیشہ ثابت ہو رہے ہیں۔ یا اگر تبلیغ و اشاعت کے میدان میں ان غیر اسلامی امور کے لیے جگہ نکالی گئی تھی تاکہ غیر مسلم رعایا مطمئن ہو سکے تو کم از کم اسی درجہ میں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی شعائر و ذخائر کی تبلیغ کے لیے بھی جگہ نکالی جانی چاہیئے تھی تاکہ مسلم رعایا بھی مطمئن ہو سکتی۔ لیکن حسرتناک بات یہ ہے کہ ان اعلانات، رواداری کے ماتحت اگر ترک کی گئی ہے تو صرف اسلامی تبلیغ اور پورے زور کے ساتھ اگر جاری ہے تو صرف انہیں مقاصد کی علمی و عملی ترویج جو اسلام کی تخریب کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔

آج ان مسلم ممالک کی یونیورسٹیاں۔ ان کے کالج، اسکول اور تمام ابتدائی اور انتہائی مدارس کروڑہا روپیہ صرف کر کے ان ہی دہریانہ اور مخرب اسلام و ایمان تعلیمات کی ترویج میں مصروف ہیں جن کے ہوتے ہوئے قلوب میں اسلام اور ایمانی کردار کو پاؤں جمانے کا موقع نہیں مل سکتا بلکہ دل و دماغ اس حد تک ماؤف اور مسخ ہو جائیں کہ یہ اسلامی اخلاق اور ایمانیات ہی ان کے نزدیک انسانیت کی تباہی کا ذریعہ محسوس ہونے لگیں۔

پھر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ انہی یونیورسٹیوں اور کالجوں کو اسلامی درسگاہیں اور ان کی تعلیمی جد و جہد کو اسلامی تعلیمات باور کرانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے گویا جو مرض ہمارا ہے اس کو ہم پال بھی رہے ہیں اور پھر اپنی خوش فہمی سے اس کو اپنی صحت بھی سمجھ رہے ہیں۔

غرض اعلان ہے غیر جانبداری کا اور عمل ہے کفر کی جانبداری کا اس لئے مسلمانوں کے دل اگر ایک طرف اپنی بے بسی اور بے شوکتی یعنی اغیار کی مسلط شوکتوں سے خون تھے تو دوسری جانب اپنی شوکتوں اور اقتداروں نے بھی ان کے دلوں کو مجروح کرنے میں

کوتاہی نہیں کی۔ وہ غریب بن کر بھی پامال ہوتے اور غنی ہو کر بھی مارے گئے، اور اسلامی طبقات کی غربت اور امارت دونوں ہی نے مل کر اسلام کی تخریب کے وہ سامان بہم پہنچائے کہ دشمنانِ اسلام کو ہاتھ پیر ہلانے کی بھی زیادہ ضرورت نہ رہی۔

سعدی از دست خویشتن فریاد

غرباء سے خطاب

یہ ممکن ہے کہ ان ممالک کے غریب اور بے سر و سامان مسلمانوں نے شخصی یا اجتماعی طور پر تبلیغی مقاصد پر کوئی توجہ کی ہو لیکن ریاستی اور سلطنتی طور پر کسی تبلیغی جد و جہد یا اسلامی شعائر کو بلند رکھنے کا ان خطوں میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ ان حالات میں ان ممالک کو اسلامی ممالک کہنے کے بجائے مسلم ممالک کہا جانا ہی کسی حد تک درست ہو سکتا ہے اور وہ بھی بحیثیت مذہب نہیں بلکہ بحیثیت قوم اور قومیت بھی ہمہ گیر نہیں بلکہ وطنی اور جغرافیائی حیثیت کی۔

اس لئے یہ مسلم ممالک اپنے اپنے وطن کی خدمت ضرور کر رہے ہیں مگر اسلام کی خدمت سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ یہی حال غلام ممالک کے بے خبر مسلمانوں کا بھی ہے جن کے نزدیک ان یورپ کے پھیلائے ہوئے جذبات وطنیت اور قومیت کا صبح و شام نام لے لینا اور اسے ہی اسلام کی منادی سمجھنا اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

مسلم ریاستوں کی اس مرعوبیت اور عوام کی اس ذہنی غلامی کو دیکھ کر جس طرح معاندین ممالکِ اسلامیہ شاداں و فرحاں ہیں اسی طرح حامیانِ ممالکِ اسلامیہ اشکبار ہیں مگر ان کی آواز اس قدر کمزور کر دی گئی ہے کہ وہ امراء کے ایوانوں تک پہنچ نہیں سکتی اس لئے وہ اپنی بے بسی اور بے کسی پر دل مسوس کر رہ جاتے ہیں: ؎

امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملّتِ بیضا غربا کے دم سے

غربا ہی سے اسلام کو توقع ہے۔ وہی اس کی حقیقی اور سچی خدمت کرتے آئے ہیں اور کر رہے ہیں انہی کو آج بھی دین کی حفاظت اور اسلام کی اشاعت پر کمربستہ ہو کر فریضۂ تبلیغ کو سنبھال لینا چاہیئے اور انہی آداب و شروط سے اس وظیفہ کی ادائیگی کے لئے کھڑا ہو جانا چاہیئے جو آیتِ دعوت سے اس مختصر رسالے میں پیش کئے گئے ہیں۔

دستور العمل ایک نظر میں

اگر اسلامی مبلغ آیتِ دعوت کے پیش کردہ اصولِ دعوت اسلام پر حسب ذیل تدابیر کے ماتحت کمربستہ ہوں تو امید ہے کہ ان کی تبلیغ پختہ اور دور رس اثرات پیدا کرے گی۔

(۱) پہلے تبلیغی مراکز قائم کر لئے جائیں جہاں سے مبلّغین اُٹھ کر اطراف میں دورے کریں اور ان مراکز کو اپنے مستقر ہیڈ کوارٹر کی حیثیت سے استعمال کریں اور پھر ان کا ایک مرکز المراکز ہو جو منظور شدہ ہدایات و قوانین کے ماتحت مراکز کو آگاہ کرتا رہے اور ساتھ ہی مبلغین کی خدمات کا جائزہ بھی لیتا رہے۔

(۲) آج چونکہ انفرادیت کا دور ختم ہو کر اجتماعیت کا رنگ غالب آتا چلا جا رہا ہے اور ہر کام جماعتی رنگ میں ہی پیش ہو کر مؤثر بھی ہوتا ہے اسی لئے ان مراکز سے تبلیغی دورے جماعتی طور پر ہونے چاہئیں۔ ایک شخص نہ جائے بلکہ جماعتیں بنا کر نکلیں جیسا کہ سابقہ اوراق میں اس کا شرعی ثبوت پیش کیا جا چکا ہے۔

(۳) ان جماعتوں میں کچھ نہ کچھ افراد ایسے بااثر اور با اقتدار شامل کرنے کی پوری سعی کی جائے جو اپنے منصب یا عہدے کی حیثیت سے قلوب میں باعظمت ہوں کہ اس سے تبلیغ کے اثرات جلد سے جلد بھی نمایاں ہوں گے۔

مؤثر اور پائیدار بھی ثابت ہوں گے اور ساتھ ہی ان میں ایک وسعت اور ہمہ گیری بھی پیدا ہو جائے گی۔

(۴) جس مقام پر مبلّغین کی یہ جماعت پہنچے آغازِ تبلیغ سے پہلے اس کی سعی ہونی چاہیئے وہ مقامی، بااثر اور سربرآوردہ لوگوں سے مل کر ان کو اپنا ہم خیال بنائے اور پھر انہی کے زیر سایہ اور مشورہ سے تبلیغ کا آغاز کیا جائے۔

(۵) تبلیغ میں اختلافی مسائل ہرگز نہ چھیڑے جائیں صرف بنیادی امور پر لوگوں کو لگایا جائے مثلاً بے خبر اور ان پڑھ مسلمانوں کو سب سے پہلے کلمہ توحید اور اس کی حقیقت سے آشنا کیا جائے۔ پھر انہیں نماز پر آمادہ کیا جائے بار بار کلمہ پڑھوا کر اس کی حقیقت سنائی جائے نمازیں یاد کرا کرا کر انہیں اپنی نگرانی میں ادا کرایا جائے۔ پھر ان کی معاشرت کا جائزہ لے کر بتدریج اس کی اصلاح کی جائے شرکیہ رسوم مٹائی جائیں۔ اسلامی معاشرت میں مساوات، ہمدردی، ایثار اور تواضع خاص طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے پھر ساتھ ہی ان میں باہمی امر بالمعروف کا جذبہ اور سلیقہ پیدا کرنے پر پورا زور صرف کیا جائے۔

(۶) تبلیغی جماعتیں ہفتہ ہفتہ بھر کے وقفہ سے محلہ وار گشت کر کے سابقہ تبلیغ کے اثرات کا جائزہ لیں اور آئندہ تبلیغ کا پروانہ ڈالتی رہیں۔

(۷) کوشش کی جائے کہ محلوّں کی مساجد میں اسی محلّہ کے کسی بااثر اور با اقتدار شخص کو امام بنایا جائے کیونکہ جب وہ خود جمعہ و جماعات کا پابند ہو جائے گا۔ تو غریب اور متوسط طبقہ خود بخود دین اور شعائرِ دین کی طرف جھک پڑے گا اور بہت جلد اصلاح ہو سکے گی اور با آسانی مساجد علم و عمل سے پُر ہو جائیں گی اسی مصلحت سے اسلام نے امامتِ صلوٰۃ کا عہدہ امیر المومنین کے سپرد کیا تھا کہ جب امرا اور خلفاء خود مساجد میں حاضر ہوں گے تو عام پبلک کے لئے یہ ایک مستقل ترغیب و تشویق اور عملی دعوت ہو گی

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(۸) تبلیغی جماعتیں اپنے قائم کردہ تبلیغی اثرات کی حفاظت اسی امام مسجد کے سپرد کردیں کہ اس کی نگرانی پورے اہلِ محلہ کو پابند اور پختہ بناسکے گی۔

(۹) تبلیغ کے ماتحت ماحول ایسا پیدا کردیا جائے کہ اگر اہل محلہ میں کوئی باہمی نزاع پیدا ہو تو اس محلہ کے وہی با اثر اور مستغنی افراد اس کا فیصلہ کریں جو مسجد کے امام بھی تھے اور اس محلہ کے تبلیغی اثرات کے محافظ بھی تھے۔ اس سے اہلِ محلہ میں ایک خاص نظم پیدا ہوجائے گا اور گویا ہر محلہ ایک چھوٹی سی ریاست ہوجائے گی جس کا امیر با اثر امامِ مسجد ہوگا جس کا ایک طرف تو محلہ والوں سے نگرانی کا تعلق ہے اور دوسری طرف تبلیغ کے سلسلے سے اس کا تعلق اوپر کے تبلیغی مرکز سے بھی ہوگا۔ اس لئے نظم کا ایک سلسلہ خود بخود بلا کسی رسمی تشکیل کے قائم ہوجائے گا جو بے غل وغش بھی ہوگا اور اخلاق و دیانت پر مبنی بھی ہوگا۔ اسی کے ساتھ اگر اس محلہ کی زکوٰۃ و صدقات کا بیت المال بھی اسی مسجد کے ماتحت ہو جس کا خازن و نگران وہی امام مسجد ہو جو محلے کی سب سے با اثر اور مستغنی ہے تو غریب اہل محلہ کی خبر گیری اور محلہ کے دوسرے کاموں کی تکمیل میں بھی ایک خاص نظم پیدا ہوجائے گا۔ جس کو قائم کردینے کی ہمت بھی یہی مبلغینِ اسلام کریں گے اور پھر وقتاً فوقتاً اس کی نگرانی بھی خود ہی رکھیں گے۔ اس مسجدی نظم کا ایک بہترین ثمرہ یہ بھی نکلے گا کہ عوام و خواص عبادات اور معاملات دونوں میں متحد اور باہم مربوط ہوجائیں گے اور وہ طبقاتی تفریق جس نے امیر و غریب کو ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں بلکہ ضد بنا دیا ہے روزانہ کے اس عبادتی اور معاملاتی اختلاط سے دور ہوجائے گی اور وہ محبت و یگانگت باہمی پھر لوٹ آئے گی جس سے مسلمان آج دور جا پڑے ہیں۔

(۱۰) پھر مبلغین انہی مساجد میں ائمہ مساجد کی نگرانی میں ایسے مختصر مکاتب قائم کردیں جو مسلمان بچوں کی ابتدائی مذہبی اور دینی معلومات کے کفیل ہوں۔ قرآن حکیم کی تعلیم

کے ذمہ دار ہوں اور ان کی نمازوں کی نگرانی اور عام شوخی و شرارت کی اصلاح کی کفایت کریں۔ اس سے بچوں کا ابتدائی پرداز اسلامی اور دینی طور پر پڑ جائے گا جو بڑھاپے تک ان کے کام آئے گا۔ اور پھر اگر وہ کسی معاشرتی تعلیم کے سلسلے میں ڈالے بھی گئے تو ان پر برے اثرات غالب نہ آسکیں گے۔

پس پہلی دفعات سے بڑوں کی اصلاح ہوجائے گی اور اس کی آخری دفعہ سے بچوں کی جو آئندہ بڑے بننے والے ہیں۔ نیز اس نظم کے ماتحت غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کی صورتیں بھی بآسانی پیدا ہوسکیں گی جن کے لئے مسلمانوں کا یہ نظم اور اس نظم سے پیدا شدہ ماحول بہترین معین ثابت ہوگا۔

یہ دس اصول ہیں جن پر عملدرآمد کرنے سے امید ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح بھی ہوگی اور جو دین کا بنیادی مقصد ہے اور ان میں نظم و ضبط بھی پیدا ہوگا۔ جو سیاست کا اصلی مقصد ہے اس طرح مسلمانوں کی سیاسی اور دینی زندگی دونوں کا ایک اچھا امتزاج ہوجائے گا جس کی بڑی خوبی یہ ہوگی کہ سارے اجتماعی نظام کا رنگ خالص دینی اور اسلامی ہوگا۔ اور اس سے ایسے رنگوں کے اتر جانے کے امکانات پیدا ہوجائیں گے جو ہماری دشمن اقوام نے مسلمانوں میں پیدا کر دیئے ہیں۔

افسوس ہے کہ آج ہم اپنی غلط فہمی اور غلط روی سے اپنی شوکت و قوت یا غلبہ و تسلط کو اعداد و شمار کے نوشتوں و اقلیت و اکثریت کی الجھنوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ جلسوں کی آرائش اور تجویزوں کی نمائش میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ مظاہروں کی گرم بازاری اور نعروں کی شوراشوری میں سمجھ رہے ہیں اور جیسا سمجھا دیا گیا ہے سمجھتے چلے جارہے ہیں لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔

مسلمانوں کی شوکت و قوت کا راز اعلائے شعائرِ دین، اتحادِ عمل، طبقاتی اعتماد اور توازن، امیر و غریب کا اختلاط، معاملاتی مساوات اور اپنے مفاسد و نزاعات

پر خود قابو پا لینے میں مضمر ہے جس کے لئے یہ مذکورہ بالا اصول پیش کئے گئے ہیں۔ اگر مبلغین اسلام آیتِ دعوت کے بیان فرمودہ قوانین کے ماتحت ہر ہر قصبہ اور گاؤں میں یہ تبلیغی نظم قائم کر دیں جس میں دین و دنیا دونوں منظم ہو جاتی ہیں اور چند مواضع میں بھی اس کا نمونہ قائم ہو جائے تو گمان ہوتا ہے کہ جلد سے جلد حالات تبدیل ہونے لگیں گے اور اہم خوشگوار نتائج کی توقع قائم ہو سکے گی۔

دعوۃ اکیڈمی کے اغراض و مقاصد

- دعوت و تبلیغ کے میدان میں تعلیمی تربیتی اور تحقیقی پروگراموں کی منصوبہ بندی کرنا اور انہیں فروغ دینا۔
- مساجد کے أئمہ اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے تربیتی پروگرام تیار کرنا۔
- دعوت و تبلیغ اور تربیت أئمہ کے پروگرام کا لائحہ عمل اور طریق کار وضع کرنا۔
- دعوتی میدان میں اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کو پھیلانے کیلئے مناسب منصوبہ بندی۔
- دعوتی نقطہ نظر سے سمعی و بصری پروگرام تیار کرنا۔
- ملک کے اندر اور باہر دعوت اسلامی کے مقاصد رکھنے والے دیگر اداروں کے ساتھ تعاون اور رابطہ۔
- خط و کتابت کے ذریعہ عوام الناس تک دین کی دعوت پہنچانا۔
- دعوت و تبلیغ کا ایک بین الاقوامی معلوماتی مرکز قائم کرنا۔
- اکیڈمی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے دعوتی کتب، رپورٹیں تعلیمی جائزوں اور دیگر ایسے مواد کی اشاعت کا اہتمام کرنا جو دعوتی کام میں مدد و معاون ہو۔
- اکیڈمی کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے علاقائی مراکز قائم کرنا۔

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد